نئے
اقبال مجید
خاموش مکالمہ

خاموش مکالمہ

اقبال مجید

کتاب دار

خاموش مکالمہ

اقبال مجید

کتاب دار

نام کتاب : خاموش مکالمہ
مصنف : اقبال مجید
پتہ : بنگلہ نمبر 2، سورج فارمس، ایرپورٹ روڈ، بھوپال-462001□□
موبائل : 09893764746
اشاعت : ۲۰۱۷ء
کمپوزر : محمد شاکر ندوی
سرورق : شاداب رشید
قیمت : ۲۵۰ لائبریری کے لیے: ۳۲۵
ناشر : کتاب دار، ۱۰۸/۱۱۰، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی-۸
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ممبئی۔ ۳، فون: 23774857
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۶، فون:23216162
عرشیہ پبلی کیشنز، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کولونی، دہلی-۹۵، فون:9971775969
ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-۲، فون:9810784549

KHAMOSH MUKALMA

by Iqbal Majeed

Add : Bangla No.2, Suraj Farms, Airport Road,
Bhopal - 462001. Contact: 09893764746
Ist Edition: 2017
Composing : Mohd. Shakir Nadvi
Cover Design : Shadab Rashid
Rs. 250/- Library Edition: 325/-
Publisher: : KITAB DAAR, 108/110, Jalal Manzil,
Temkar Street, Mumbai - 400 008.
Mob: 9869 321477 - 9320 113631

(پرتیک آفسیٹ، گائے واڑی ممبئی سے شائع ہوئی)

انتساب

میرؔ کے
اس شعر کے نام

ہم مست بھی ہو دیکھا لیکن مزہ نہیں ہے
ہُشیاری کے برابر کوئی نشہ نہیں ہے

افسانے تین ابواب پر مشتمل ہیں

بابِ اوّل

شمس الرحمن فاروقی کی نذر

باب دوئم

مہدی جعفر کی نذر

باب سوم

علی احمد فاطمی کی نذر

ترتیب

باب اوّل

باب دوم

باب سوئم

باب اوّل

۱۔ خاموش مکالمہ

۲۔ سوئیاں اور شیر

۳۔ حنوط کی ہوئی تلوار

۴۔ اپنے اپنے توتے

خاموش مکالمہ

انگلی اُٹھا چکنے کے بہت دیر بعد اسے موقعہ ملا تھا۔ اس لیے وہ جلدی جلدی ذرا بھی کہیں ٹھہرے بول رہا تھا۔

وہ موٹے اور بھدے جسم کا ادھیڑ آدمی تھا، یہ بات کسی کو محسوس نہ ہوئی بس اس کے منہ سے پھوٹتے ہوئے الفاظ سنے جا رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''آمرانہ بدبختی کی جانب رینگتے ہوئے بدطینت اور بدصورت بچھ کھوپڑ جو زمین کے اندر رہتے ہیں اور بہت سخت جان ہوتے ہیں کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اس لیے جو جی چاہتا ہے اور جب تک جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے ظلم سے زمین کہاں اور کتنی لال ہوئی''۔

پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا، پتا نہیں کہ لوگ اس کو سن کر کیا سمجھ رہے تھے۔ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا وہ قوم کو یہ انتباہ کر رہا تھا کہ وہ آمرانہ نظام کو گلے لگانے کا جتن کر رہی ہے۔ کیا وہ Tyrany of majority کی خرابیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ تو بس بول رہا تھا۔ بے صبری سے بولے چلا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی اس کے منہ پر طاقتور ہاتھ رکھ کر گرفت اتنی سخت نہ کر دے کہ وہ پھر کچھ بول ہی نہ سکے۔

میں دیکھ رہا تھا بولتے وقت اس کے اندر خاصا غصہ بھرا ہوا تھا۔ مجھے اس لئے اس میں دلچسپی بھی ہونے لگی تھی۔ دراصل غصے میں بولتے ہوئے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ایسے لوگ Status quo کے خلاف بولتے ہیں۔ ایسے غصے کو

مبارکباد دینا چاہیے۔ میں نے دیکھا غصے کا دباؤ بولنے والے کے سینے میں بڑھتا جارہا تھا جس کے نقوش اس کی بل پڑی پیشانی، تمتماتے ہوئے گالوں اور سوکھے ہونٹوں پر ابھر آئے تھے۔ ہاتھ میں ریموٹ پکڑے کرسی میں جکڑا آنکھیں پھاڑے میں بولنے والے کو دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ وہ ذرا کرخت اور بلند آواز میں بولا۔

مجھے چقندر ناپسند ہیں۔ میں چقندر کھانے والوں کے چہرے پر سیاہی پوتنے میں خوشی محسوس کروں گا۔ میرا ایمان ہے کہ چقندر اس زمین پر لال ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ جس میں بے گناہ لوگ قتل کر کے گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں تو میں جواب دوں گا یہ میری آستھا کا سوال ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ چقندر کے شوقین ہی چھت پر لال بیکن لگی گاڑیوں پر چلنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

موٹے اور بھدے آدمی کی باتوں کو غور سے سنتے ہوئے میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میری بیوی کو اتنا تیز بخار ہے کہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کے پھائے رکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

غصے میں بولنے والا جس پلیٹ فارم سے بول رہا تھا وہاں کچھ پلوں کے لیے بھی چپ ہو جانا ناگوار ہوا کرتا تھا، کیونکہ جو وقت بھی دیا جاتا تھا وہ بولتے رہنے کے لیے دیا جاتا تھا کہ مکالمہ جاری رہے۔ کبھی کبھی چار چار لوگ ایک ساتھ اپنے اپنے نظریئے اور اپنے اپنے دلائل کے ساتھ یوں گتھم گتھا ہو جاتے کہ نہ کوئی نظریہ رہ جاتا اور نہ کوئی دلیل۔ یکا یک میرے کانوں میں بخار میں پھنکتی ہوئی بیوی کے کراہنے کی آواز آئی، لیکن میں ہمہ تن گوش اس بھدے بدن والے کو دیکھتا رہتا ہوں جسے آگے بولنے کے لیے روک دیا گیا ہے۔

مجھے یہ فکر تھی کہ دیکھیں اس مکالمے میں زمین میں رہنے والے بچھ کھوپڑوں سے مقرر کی کیا مراد ہے اور یہ بھی کہ چقندر کھانے والوں اور لال بیکن والی گاڑی کے درمیان کیا رشتہ ثابت کیا جارہا تھا اور مکالمے میں ان انکشافات نے میرے خون میں جو گرمی پیدا کر دی

تھی ان سے مکالمہ کس طرح حقائق پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔

مگر پھر اسی وقت یہ ہوا کہ مکالمے میں حصہ لینے والے سارے لوگ یکایک کہیں غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک لمبا سا وجیہ آدمی نک سک سے درست زربفت کی قیمتی اور جھلملاتی شیروانی اور چوڑی دار پہنے جسے درزیوں نے بڑی محنت سے تراش خراش کے بعد اس کے سڈول بدن پر سجایا اور سنوارا تھا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا وہ تو کوئی اسٹار تھا۔ پاس ہی ایک چمچماتی ہوئی خوبصورت رنگ کی نئی نویلی اسکوٹر کھڑی ہے۔ وہ اسکوٹر کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے۔

"دیکھا آپ نے"

"اسے دیکھ کر آپ کی لار ٹپک پڑی نا؟"

"بیٹا دیکھے گا تو جب تک آپ یہ اسکوٹر اس کو دلا نہیں دیں گے نہ وہ خود سوئے گا نہ آپ کو سونے دے گا"۔

آپ پوچھیں گے بھلا ایسی کیا بات ہے۔

میں بتاتا ہوں۔ یہ دوڑتی نہیں اُڑتی ہے۔ جاپان کی بلٹ ٹرین کی طرح۔ ہاں ہاں کہیے کہ پیٹرول بہت کھاتی ہوگی۔

ہرگز نہیں ایک لیٹر میں ستر کلومیٹر۔

آپ کہیں گے دیکھ ریکھ پر جلدی جلدی خرچ ہوگا۔

میرا جواب ہے دو سال تک آپ کو جیب میں ہاتھ نہیں ڈالنا پڑے گا۔

یہ کہہ کر شیروانی والا اپنی شیروانی کی جیب سے رومال نکالتا ہے تو دوا کی گولیوں کا ایک پتا فرش پر گرتا ہے، اس پتے کو اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے اور پتا دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔

"تھری ان ون" یعنی سردی زکام اور بخار کی اچوک دوا، نام ہے 'ماتاجی کی

گولیاں، یہ کہہ کر شیروانی والا نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

میں اس موٹے اور بھدے آدمی کا انتظار کرتا ہوں جس نے "ٹائرنی آف مجاریٹی" کا ذکر چھیڑ کر میرے اندر ایک غصے کو جگا دیا تھا۔ مگر اس کی جگہ ایک خوبصورت کمسن اور جوان لڑکی بادلوں کی دھند سے اُبھر کر نکلتی ہے، جس کی مستانی اور قاتل جوانی سر سے پیر تک ایک کیف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ بے خودی کی حالت میں اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے ایک طرف دیکھتی ہے تو اسے تندرست اور کسرتی بدن کا ایک نوجوان نظر آتا ہے۔ لڑکی نشیلی اداؤں کے ساتھ نوجوان کی جانب بڑھتی ہے، پشت پر آ کر اپنی ایک بانہہ نوجوان کی گردن میں حائل کر دیتی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے نوجوان کی کمر کو اپنی مخروطی انگلیوں سے ٹٹولتی ہے۔ مرد کے پتلون کی بلٹ میں کوئی رنگین پیکٹ اٹکا ہوا ہے جس کا سامان مجھ جیسے کمزور ارادے کے انسان کو جنسی ترغیب دینے کو کافی ہے۔ میں بیوی کے بخار کو بھول جاتا ہوں، میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ ابھی ایک آدمی بے حد غصے میں تھا۔ وہ دنیا میں مسلمانوں کو بدنام کیے جانے کی بات کر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا جس نے جرمنی میں یہودی مارے کیا وہ مسلمان تھا یا جس نے عراق اور افغانستان میں جتنے بے قصوروں کو مارا کیا وہ مسلمان تھا۔ وہ اپنا غصہ میرے خون میں پہنچانا چاہ رہا تھا۔ وہ دنیا بھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر غیر مسلموں کے انسانیت پر مظالم یاد دلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا، آواز میں اس غصے کی کپکپاہٹ عیاں تھی۔ میری بیوی ایم اے کی طالبات کے کلاس میں کہتی تھی۔

مکالمہ فکر کو مہمیز کرتا ہے۔

ردّ قبول کے تحفے تحائف دیتا ہے۔

لیکن اس خوبصورت لڑکی کی قاتل ادائیں، مخروطی انگلیوں سے کمر میں بندھی بیلٹ کو ٹٹولنا وہ بھی تو ایک مکالمہ تھا۔ جیسے ہی ان نازک اور خوبصورت انگلیوں نے بیلٹ میں ٹھسے

رنگین پیکٹ کو نکالا، اس پیکٹ کے سامان کے تصور سے پیدا ہونے والا احساس لذت مجھ پر کچھ اس طرح سوار ہو گیا کہ میرے اندر اس مقرر کا جگایا ہوا غصہ ایک پل میں کافور ہو گیا۔ میں اس غصے سے باہر آیا تو خیال آیا کہ لڑکا یونیورسٹی میں آجانے کے بعد کافی دنوں سے اسکوٹر دلانے کی فرمائش کر رہا ہے تو کیا مجھے زربفت کی شیروانی زیب تن کیے اس شہرت یافتہ آدمی کی بات مان لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی ملک اور ملک کے باہر لاکھوں اس کے دیوانے تھے جب وہ اس اسکوٹر کی سفارش کر رہا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ غیر معمولی ہی ہوگی۔

پھر یکا یک سامنے کے منظر میں مکالے میں شامل چاروں لوگ واپس آجاتے ہیں۔ میں بھدے بدن والے غصائے ہوئے آدمی کو دیکھتا ہوں جو تصویر کی طرح ایک چوکھٹے میں جڑا ایک انگلی ہوا میں اُٹھائے سامنے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ بار بار انگلی اُٹھا کر یہ بتانا چاہ رہا ہے کہ وہ بولنا چاہتا ہے لیکن اس کا اشارہ کوئی نہیں دیکھتا۔ اس کے پہلو میں بیٹھا آدمی کسی کو نہیں بولنے دے رہا ہے وہ بار بار اپنی آواز اونچی کر کے ایک ہی جملہ دہرائے جا رہا ہے۔

دیکھئے مجھے بولنے دیجئے۔ سیاست میں کوئی دشمن مستقل نہیں ہوتا، آج جو ایوارڈ میں لوٹا رہا ہوں کل دشمن کے دوست ہو جانے پر اسے واپس بھی لے سکتا ہوں۔

تیسرا آدمی چلاتا ہے، ”دیکھئے میری بات سنئے“۔

میں کہتا ہوں بم رکھے جا رہے ہیں، دھماکے ہو رہے ہیں، جانیں جا رہی ہیں، گرفتاریاں بھی ہو رہی ہیں لیکن ہم کو غصہ نہیں آنا چاہئے۔ غصے میں اور بم میں یہی فرق ہے، بم ایک دم سے یکا یک پھوٹتا ہے، بس ذرا دیر کو لیکن غصہ پنپتا رہتا ہے۔ اندر ہی اندر پنپتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے۔

موٹا اور بھدے بدن والا بیقرار ہو کر بولنے کے لیے پھر انگلی اُٹھاتا ہے لیکن اس

کی انگلی اُٹھی ہی رہتی ہے، ادھر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ وہ شیروانی والے اور قاتل اداؤں والی لڑکی کے منظر پر آنے سے پہلے کیا کہہ رہا تھا اور کس قدر غصے میں تھا، یہ بات شاید میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی بھول چکے تھے۔

اسی اثناء میں تیسرا دوسرے کی بات کاٹ کر اپنی بات کہنے کے لیے ایک دم سے پھر پھاند پڑتا ہے۔

"یہ تو طے ہے کہ لوکل سپورٹ کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سپورٹ بہت آسانی سے مل سکتی ہے۔ پیسہ آج خدا کا درجہ رکھتا ہے، تھوڑے سے پیسوں کے لیے آج آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پیسے کے لیے ہم عورتیں بیچتے ہیں، بیٹیاں بیچتے ہیں، اپنے دل گردے، آنکھیں اور ضمیر کیا نہیں بیچتے۔ موٹا آدمی پھر انگلی اُٹھاتا ہے اور اپنی پشت پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتا ہے، وہ بولنا چاہتا ہے، سب کو چپ کرا کر بولنا چاہتا ہے، اتنی دیر بولنا چاہتا ہے جتنی دیر میں اس کی بات ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے۔ کوئی سنے یا نہ سنے وہ بولتے رہنا چاہتا ہے، اس کے پاس آواز ہے اور الفاظ ہیں، وہ ان سب لفظوں کو یک مشت ایک ساتھ ایک وقت میں باہر نکالنا چاہتا ہے، یکبارگی میری بیوی کے کراہنے کی آواز میرے کانوں میں آتی ہے۔ میں اس کے بستر کے پاس جاتا ہوں، اس کا بخار شاید کچھ کم ہو گیا ہے، وہ دھیرے سے کہتی ہے۔

کتنے لوگوں کی باتیں تم سنتے ہو، منہ کھول کر اور آنکھیں گڑا کر سنتے ہو، میرے پاس نہ تو آواز ہے اور نہ الفاظ اس لیے تم نہیں سنتے، کتنی دیر سے میں پانی مانگ رہی ہوں، ایسی آواز میں اور ایسے لفظوں میں جنھیں صرف شوہر کے کان ہی سن سکتے ہیں، تو کیا تم سب کچھ لگاتار سنتے سنتے بہرے ہو چکے ہو"۔ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں، اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہوں، وہ ہاتھ جھٹک دیتی ہے، لپک کر پانی لینے جاتا ہوں، گلاس لا کر اسے ایک ہاتھ کے سہارے بستر سے اُٹھاتا ہوں، اس کے خشک ہونٹوں سے گلاس لگاتا ہوں،

وہ آبدیدہ ہو کر دو گھونٹ پانی کے پیتی ہے اور پھر بستر پر دراز ہو جاتی ہے۔

میں جلدی سے پھر ایک بار اس بولنے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔لیکن وہ بولنے والا اب منظر میں نہیں ہے بلکہ کسی ملک سے ستائے ہوئے لٹے پٹے ہزاروں بے حال اور خانماں برباد، مہاجر عورتوں بچوں اور بیماروں کے قافلے ژولیدہ مواور آبلہ پا جوق در جوق ایک طرف حالت سراسیمگی میں افتاں وخیزاں چلے جا رہے تھے،ان انسانوں کے سروں پر چنگاریاں برساتا کھلا آسمان تھا اور پیروں کے نیچے نہ جانے کب کا قصاص لیتی پتھر کی چلچلاتی زمین، اس ہجوم میں ایک جوان ماں اپنے شیر خوار بچے کے منہ میں سوکھی چھاتی ڈالتی ہے، بچہ اسے مسوڑھوں سے نوچتا ہے اور جب اس سے کچھ نہیں ملتا تو منہ میں دبی چھاتی اگل کر رونے لگتا ہے۔

اس ہجوم سے دور ایک لق و دق میدان تھا۔ بے آب وگیاہ۔ وہاں پھٹی پرانی اجڑی پچڑی چھولداریاں مہاجروں کے لیے گاڑی جا رہی تھیں، پاس ہی جنگلی علاقے کے جھاڑ جھنکاڑوں میں منہ پر ڈھاٹا باندھے بڑی بڑی گول آنکھوں والے لوگ پھاوڑے اور بیلچے لیے زمین کھود رہے تھے، ایک طرف دو تندرست ٹٹوؤں کی پیٹھ پر ۳ لاشیں اوندھی لٹکی ہوئی تدفین کے انتظار میں تھیں، وہ کتے بھی ایک طرف دبکے بیٹھے ہانپ رہے تھے، جنھیں کچھ دیر بعد ان لاشوں کو کھود کر کھانا تھا، یہ منظر بھی کتنی طرح کی آوازوں چیخوں اور سسکیوں کے ساتھ مکالمہ کر رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ منظر آنکھوں کے راستے دل میں اُتر کر اور بدن کے خون میں دوڑ کر کچھ بولے، چیخے، جھنجھوڑے اور آنکھوں میں خون کا چشمہ اُبلے اور غصے کے تپتے جھلستے اولے برسا کر بدن پر پھپھولے ڈالے بس یکا یک کچھ ایسا ہوا کہ میدان اور جنگل اور چھولداریوں اور خانماں برباد ہجوم کا وہ منظر اس منظر کی صعوبتیں، اندوہناکی، شقاوت اور بدبختی پردے کے پیچھے روپوش کسی غیبی طاقت نے یکا یک کھسوٹ لی اور وہ منظر ایسا غائب ہوا جیسے جلتے توے پر پانی کی گرنے والی بوند چھن سے ہو کر رہ

جائے، بس اسی چھوٹے سے چھوٹے لمحے میں ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کو کیسے آگے ڈھکیل دیا جاتا ہے، جو پچھلے منظر کو آناً فاناً دھوئیں کی طرح اُڑا دیتی ہے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

وہ جوان اور برق کی طرح لہراتے جسم والی لڑکی ناچنا شروع کرتی ہے۔ اس کی دونوں رانیں، کولھے، کمر اور پیٹ حالت برہنگی میں دعوت نظارہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں، چھاتیوں کی گولائیاں اور زیر ناف کے تنگ حصے سامعین کو اتنی بار دکھائے جا چکے تھے کہ کم سے کم مستور اور زیادہ سے زیادہ برہنہ ہونے کے باوجود اپنی کشش کھو چکے تھے۔ لڑکی ٹھمکے لگا کر سامعین کو کوئی پان مسالہ کھانے کی ترغیب دے رہی ہے۔ پانچ روپئے کے پان مسالے کے لیے کروڑوں روپئے کی حرمت کی بے توقیری دیکھ کر میں نے تیزی سے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی اوپر اُٹھا کر بولنے کی اجازت مانگی مگر تب تک دیر ہو چکی تھی، وہ عورت سب کچھ بیچ باچ کر چھلاوے کی طرح غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ نازک باہوں اور شفاف جلد والی ایک کمسن لڑکی پُر فضا پہاڑی کے ایک مترنم جھرنے کے گرتے پانی کی جھالروں کے نیچے عالم مدہوشی میں کمال لطف و انبساط کے ساتھ نہا رہی تھی، اس کی آنکھوں کی چمک بدن کا الھڑپن روح کی سرشاری منظر کے ایک ایک پل سے پھوٹ رہی تھی، وہ کسی آر پار دکھائی دینے والے خوش رنگ صابن کی ٹکیہ کو اپنے گورے بدن پر اس طرح مل رہی تھی جیسے وہ مشک وعنبر ہو، اس کے جھاگ کو اس طرح بدن پر اچھال رہی تھی جیسے عاشقوں کا خون ہو، ایک پل کو مجھے لگا کہ پاس کی چٹان پر کھڑا میں بھی نیم عریاں حالت میں اس لڑکی کے ساتھ نہا رہا ہوں۔ ایسی سرمستی کا احساس مجھے پہلی بار ہو رہا تھا، ابھی میں اس کے لطف سے باہر نہ آپایا تھا کہ ایک ٹھوس اور کسرتی بدن والا نوجوان اپنی قمیص کا گریبان کھولے دھندلائے ہوئے نیم خوابیدہ سے ماحول سے اُبھر کر نکلا اور اپنے کھلے گریبان سے جھانکتی چھاتی جس پر سر رکھ کر لڑکیاں سونے کی تمنا

کرتی ہیں، خوشبو کی پچکاریاں چھوڑنے لگا۔ پچکاریوں سے خوشبو کا دھواں نکل رہا تھا۔ مشامِ جاں کو مست اور بے خود کر دینے والی خوشبو درخت کی اوٹ میں کھڑی ایک خوبصورت لڑکی کے احساس پر کچھ اس طرح چھا جاتی ہے کہ وہ بڑے والہانہ انداز میں مرد کی آغوش میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں خود کو کسی مزاحمت کے بغیر سپرد کر دیتی ہے۔ تھوڑی دیر کو مجھے خیال آتا ہے کہ شاید بازار میں ایسی خوشبوئیں بھی موجود ہیں جو قاتل حسیناؤں کو خوشبو کے جھونکے کے مانند آپ کی گود میں ڈال دیں۔

لیکن یکایک بجلی چلی جاتی ہے۔ سامنے اسکرین پر اندھیرا ہو جاتا ہے۔ بولنے والے انگلیاں اُٹھا کر بولنے کی اجازت لینے والے سب اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ جب باہری دنیا اندھیری ہو جاتی ہے تو آپ کے اندر کی دنیا روشن ہو جاتی ہے۔

آپ یقین کریں میں نے اس روشن دنیا کے پردے پر ایک کتے کو دیکھا۔ سڑک پر لاوارث گھومنے والا کتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خوبصورت اور نازک بدن لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے خوشبودار صابن سے نہا رہی تھی، وہ خارش زدہ کتا اس کی لاش کو ایک گڑھے سے نکال کر کھینچ رہا ہے۔ دل نے کہا کوئی بعید نہیں کہ وہ لڑکی ماردی گئی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے سپردِ خاک کیے جانے کا موقع نہ رہا ہو۔ خوبصورت لڑکیاں ہمیشہ بازار کے قبضے میں کہاں رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بازار سے چھڑائے جانے کے دوران ماری گئی ہو۔

ابھی لائٹ نہیں آئی تھی۔ میں ریموٹ پکڑے کرسی پر ساکت بیٹھا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یکایک میں نے اس نوجوان کو دیکھا جو اپنی کھلی چھاتی پر خوشبو چھڑک رہا تھا اور اس کی خوشبو سے ایک لڑکی اس کی گود میں آ گری تھی۔

اس کی چھاتی کھلی ہوئی تھی۔ ایک نقاب پوش ہاتھ میں ننگی تلوار لیے اس کے پیچھے

کھڑا تھا۔ غالباً نوجوان کے سر قلم کیسے جانے کے ویڈیو کے بنائے جانے کی تیاری تھی۔ نوجوان صرف خوشبو چھڑکنے کا ہی کام تو نہیں کرتے، جان بھی تو چھڑکتے ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، سیدھے ہاتھ کی انگلی اوپر اٹھاتا ہوں۔ میری بے قرار آنکھیں بتا رہی ہیں کہ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور اگر مجھے بولنے نہ دیا گیا تو تو۔ لیکن تب ہی میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس نہ جانے کتنی انگلیاں اُٹھ رہی تھیں، وہ سب مجھ سے پہلے بولنا چاہ رہے تھے، مجھ سے زیادہ دیر تک بولنا چاہ رہے تھے بلکہ مجھے لگا کہ وہ بولے جا رہے ہیں، ان کے گلے کی نسیں بولنے سے بار بار پھول رہی تھیں لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی یا نکل رہی تھی تو میں ہی اسے نہیں سن پا رہا تھا اس لیے کہ میں خود بھی بولے جا رہا تھا جسے کوئی سن نہیں پا رہا تھا۔ یکبارگی لائٹ آگئی۔ ٹی وی تھوڑی دیر میں روشن ہو گیا۔ وہ قبر جس میں لاشوں کو گاڑا گیا تھا اب کیمرے کی زد میں تھی۔ کیمرہ دھیرے دھیرے قبر پر ایک مڑے تڑے پیکٹ کو پڑا دکھا رہا تھا۔

وہ استعمال شدہ ایک کنڈوم تھا۔

میں بولنے کے لیے اب بھی اپنی انگلی اُٹھائے ہوئے تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں کسی حالت میں بھی وہ شور نہیں مچا سکتا۔

وہ شور جو بازار سے اُٹھتا ہے اور سارے مکالموں پر چھا جاتا ہے۔

تب بھی

ایک امید تو تب بھی تھی۔

ہر طرف سے اتنی بہت سی انگلیاں اُٹھی دیکھ کر، آنکھوں کی بے چینی دیکھ کر

گلے کی پھولی ہوئی نسیں دیکھ کر

ایک امید تو تھی۔

حالانکہ کیمرہ قبر میں کیا دفن کیا گیا ہے اس کو لیکر کوئی مکالمہ نہیں کر رہا تھا بلکہ قبر کی

گیلی مٹی پر کیا پڑا تھا اس پر بات کر رہا تھا۔

لیکن پھر بھی ایک امید تو تھی۔

اندر کیا تھا؟

اس پر کبھی مکالمہ ہونے کی ایک امید تو پھر بھی تھی۔

لیکن امید اکافی نہیں تھی۔

مجھے تشویش تھی۔

بہت سے لوگوں سے پوچھا میں نے کہ اندر کی چیزوں پر مکالمہ کیوں نہیں ہوتا۔
جواب میں بس اتنا معلوم ہوا کہ بازار اندر کی چیزوں پر شاید مکالمہ نہیں کرتا۔

●●

سوئیاں اور شیر

گرمیوں کی تپتی ہوئی دو پہر تھی۔ خانقاہِ قلندریہ سے ملحق مشرق کی جانب اوبڑکھابڑ میدان میں جہاں قصبے کی میونسپلٹی نے بستی کے سات آٹھ آوارہ کتے راتوں رات مار کر گاڑ دیئے تھے، وہاں کے بے رونق آسمان پر اب چیلوں نے منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ حال میں ہی خانقاہ کا سالانہ عرس ختم ہوا تھا۔ میدان سے شامیانے، قناتیں اور دریاں وغیرہ، آدم بےزار اور کام چور کارندے مری ہوئی رفتار کے ساتھ اکھاڑ اور سمیٹ رہے تھے۔

خانقاہ کے اندر یہ خبر سنسنی پھیلا کر اب پھیکی پڑنے لگی تھی کہ انتظامیہ کے خاص رکن شیخ صلاح الدین کے پاس رجسٹرڈ ڈاک سے ایک لفافہ آیا ہے، جس پر بھیجنے والے کا نام سلیمہ خاتون لکھا ہے، یہ خبر گل شاہ تک بھی پہنچ چکی تھی، جن کی خانقاہ کے صدر پھاٹک کے پہلو میں چادر پھول، تبرک اور عطر وغیرہ بیچنے کی چھوٹی سی گمٹی تھی اور وہ پچھلے بارہ برس سے شیخ کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ بھی تھا۔ لفافے کی خبر سے گل شاہ کے پیٹ میں چوہے دوڑنا فطری تھا۔ وہ چھوٹی سی بستی کی ایک ایک گلی سے واقف تھا اس لئے اس کے واسطے یہ پتا لگانا زیادہ مشکل نہ تھا کہ سلیمہ خاتون ایک بیوہ تھیں جو سال دو سال پہلے اپنی کسی حاجت کے لئے آستانے پر بھی پیر و مرشد کے سامنے حاضری دے چکی تھیں۔ لیکن گل شاہ کی اصل بیتابی یہ تھی کہ وہ اُس لفافے کی نوعیت کا پتا لگائے جو شیخ کے پاس آیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شیخ پندرہ برس پہلے خانقاہ میں علم معرفت علم باطل اور سلوک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوا تھا کیونکہ اس کے باپ کی تمنا تھی کہ بیٹے کی زندگی روحانی برکتوں سے لبریز اور

سینہ عشق کی آگ سے روشن ہو جائے لیکن آستانے کے وعظ اور پند و نصائح کی تعلیم میں شیخ صلاح الدین کا جی نہ لگا اور نفس کو دبلا کرنے کی تکلیف دہ جسمانی مشقتوں سے وہ بھاگنے بھی لگے تھے لیکن یہ بھی درست تھا کہ خانقاہ میں اتنے لمبے قیام کے بعد شیخ خود کو تصوف کے حقائق و معارف کا آدھا شارح تو بنا ہی چکے تھے لیکن خدا جانے کیوں آستانے میں بزرگوں کے بیانات اور ذکر کی محفلوں کو دیکھ کر اکثر متوحش بھی ہو جاتے اُن کا کہنا تھا کہ ایسی شورشِ حقیقی جو سالک کو محو کر دے ان کے سینہ میں نہیں ہے۔ پیر و مرشد نے تو پہلے ہی سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بندہ دل میں خدا طلبی کی چھوٹی سی کرن کے ساتھ بس ایک عام انسان ہے لیکن انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ خدمت گزاری کا جذبہ دل میں ضرور رکھتا ہے اس لئے انتظامی امور کے بکھیڑوں کو نپٹانے کے لئے اسے منتخب کیا گیا۔ انتخاب غلط نہ تھا۔ شیخ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔

گل شاہ کو یقین تھا کہ شیخ صلاح الدین اس سے کچھ نہ چھپائے گا اس لئے جیسے ہی وہ شیخ سے ملا لفافے کے بارے میں کریدنا شروع کر دیا۔

"بڑی کھلبلی مچی ہے آستانے میں" گل نے بات شروع کی۔

"کیسی کھلبلی؟" شیخ کے استفسار پر گل شاہ نے بات کو گھما پھرا کر کہنا مناسب نہ سمجھا۔ شیخ کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا "ارے آپ تو یہاں سب کا مزاج جانتے ہیں، ایک سے ایک پاکباز ہیں یہاں"۔ یہ کہہ کر گل شاہ نے شیخ کی طبیعت کا اندازہ لگایا اور اس کی خاموشی کو تاڑا پھر ہمت کر کے اصل بات کہہ دی۔

"آستانے میں کھسر پسر ہو رہی ہے کہ آپ کے پاس کسی سلیمہ خاتون نام کی عورت کا ڈاک سے ایک لفافہ آیا ہے"۔

"سلیمہ خاتون۔" شیخ نے ذہن پر زور دیا پھر دھیرے سے بولا "ہاں آیا تو ہے"

یہ کہہ کر وہ عصر کی نماز کے لئے وضو کرنے بیٹھ گیا۔ گل شاہ اندر سے بڑا دنیادار انسان

تھا، ایک بار اس نے سوچا کہ باقی پوچھ تاچھ آگے کے لئے اٹھا رکھے لیکن پھر اپنا فیصلہ بدل دیا اور بولا۔

''ایک سلیمہ خاتون کے بارے میں تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ گوری سی ہیں لمبی سی!! مشکل سے تیس برس کی ہونگی مگر بیوہ ہیں۔ جس اسکول میں پڑھاتی تھیں وہ جب انٹر کالج بنا تو چمڑے والوں نے اس پر قبضہ کرنے کے لئے سیاست تیز کر دی، سلیمہ کا شوہر وہاں مالی مشیر تھا اور چمڑے والوں کے خلاف سرگرم بھی رہتا تھا۔ پتا نہیں کیسے ایک دن پرانی باولی کے اندر مار کر ڈال دیا گیا''۔ پھر گل شاہ نے یاد دلایا ''آپ کو تو یاد ہو گا کتنی لمبی تفتیش اور دھر پکڑ ہوئی تھی۔ شیخ وضو کر چکا تھا، گل شاہ کو کوئی جواب دیئے بغیر مصلیٰ بچھا کر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔

گل شاہ ناچار اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا۔

جمعہ اور منگل کو چھوڑ کر خانقاہ کے مختصر ہال میں جو ایوانِ مولانا روم کے نام سے مشہور تھا اور ترکی کے ایک تاجر مرید کے عطیہ سے بنا تھا، جہاں دری اور گاؤ تکیہ کا فرش تھا اور چھت پر مقامی مریدوں کے عطیات سے پنکھے لٹک رہے تھے وہاں سالکین کو ذکر کے ذریعے درس دیا جا رہا تھا۔ مائک پر ایک بزرگ بتا رہے تھے۔

''یہاں آپ لوگ کونسا علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ تصوف میں علم کے کیا معنی ہیں؟ یاد رکھئے ہمارے لئے علم سے مراد صرف وہی علم ہے جس کی مدد سے بندہ خدا تک پہنچے۔ اس لئے ہمارے علم کا سارا زور بندے کو خدا سے جوڑنے کا ہے۔ یہ علم آپ کو مالکِ حقیقی سے راضی رکھتا ہے اور دونوں جہان کی ایسی عزت آپ کو حاصل کراتا ہے کہ آپ اپنے خدا کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔

یہ تقریر شیخ صلاح الدین برسوں سے سن رہا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ہال کے اندر جھانک کر دیکھا، لوگ پوری توجہ سے مقرر کی بات سن رہے تھے، ان میں وہ نوجوان

بھی تھے جو آس پاس کے قصبوں سے آئے تھے۔ مشقت کے دن گزارنے والے، جن کی آنکھوں میں نہ کوئی خواب تھا اور نہ دلوں میں کوئی حوصلہ، سوکھے ہوئے بدن، ہونق آنکھیں، پچکے ہوئے گال۔ شیخ کو لگا کہ اس کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی ہے، وہ تھوڑا آگے جا کر ایک مقام پر رک گیا۔ سامنے پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں موسم کے رنگارنگ پھول آئے ہوئے تھے، جن کے بیج وہ خود لایا تھا، یہ کیاریاں بھی دھوپ میں پھاوڑا چلا کر خود اسی نے بنائی تھیں۔ شیخ سے پہلے کسی نے خانقاہ کو پھولوں سے مہکا تا گلشن دینے کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ جب اس نے پیٹرول پمپ والے شیروانی صاحب کے پیچھے پڑ کر پچاس گملوں کا عطیہ حاصل کرنا چاہا تھا تو وہ حیرت سے بولے تھے "کمال ہے، خوبصورتی کو تو آپ لوگ خدا تک پہنچنے میں رکاوٹ کا ذریعہ مانتے ہیں"۔

ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ خانقاہ میں شیخ صلاح الدین کے پاس ڈاک سے پہلے جیسے ایک لفافے کے آنے کی خبر چپکے چپکے پھر پھیلنے لگی۔ لفافے کے کونے پر سلیمہ خاتون کا نام پھر لکھا ہوا تھا۔ خانقاہ کی ساری ڈاک نائب سکریٹری کے پاس آتی تھی اور ساری ڈاک میں شیخ صلاح الدین کا لفافہ سب سے الگ ہوتا تھا۔ کیونکہ اسے بھیجنے والی اعلانیہ طور پر عورت ہوتی تھی۔ شیخ جی کی نیکی اور پاکیزگی کے معاملے میں اگرچہ لوگ ایک رائے تھے لیکن کبھی کبھی شیخ کا غیر متوقع ردعمل جس کا اظہار خانقاہ کے خلاف یکا یک اس طرح ہوتا جیسے پریشر کوکر پھٹ پڑا ہو، لوگوں کو ان کی طرف سے مشکوک بنائے ہوئے تھا، یہاں تک کہ خود پیر ومرشد بھی شیخ کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے گریز کرتے تھے۔

وہ لفافہ شاید لوگوں کی نظروں میں اس لئے بھی مشکوک تھا کہ شیخ صلاح الدین کے دو بچے بھی تھے اور ان میں سے ایک ابھی شیرخوار تھا کہ ان کی بیوی زچگی میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ خانقاہ کے بعض لوگ جو شیخ سے حسد رکھتے تھے انہوں نے گل شاہ کو پکڑا جو شیخ کا دوست بھی تھا، عزت بھی کرتا تھا، اس کو راضی کیا کہ وہ شیخ سے سلیمہ خاتون کی

حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔ گل شاہ تو خود جستجو میں تھا دوسرے لفافے کی آمد پر اس کے کان کچھ اور بھی کھڑے ہو گئے۔

گل شاہ جب ٹوہ لینے کے لئے شیخ کے کھپریل والے چھوٹے سے پرانے گھر میں داخل ہوا تو شیخ کا چھوٹا بیٹا گبھے پر پڑ زور و شور سے رو رہا تھا اور ہاتھ پیر چلا رہا تھا اور شیخ اس کے لئے جلدی جلدی پھولے ہوئے ہاتھ پیروں سے دودھ کی شیشی بنانے میں لگا ہوا تھا۔ شاید مطلب برابری میں زیادہ دیر ہو گئی تھی اس لئے بچہ پوری طاقت سے روتے روتے اب بے دم ہونے لگا تھا اس لئے گل شاہ نے بے اختیار بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور بہلانے لگا۔ تب تک دودھ کی شیشی شیخ نے بچے کے منہ سے لگا دی۔ بچہ نہ جانے کب سے بھوکا تھا، بچے کو پُر سکون ہو کر دودھ کی شیشی پر مشقت کرتے دیکھ کر شیخ کی آنکھیں بھر آئیں۔ دودھ کی شیشی اس نے گل شاہ کو تھما دی اور دھیمی آواز میں بولا۔

''وہ دن جب زچگی میں میری بیوی ختم ہوئی تھی پیر و مرشد آستانے سے چل کر یہاں آئے تھے۔ شیروانی کے تین بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، کالر اُدھڑ گیا تھا۔ گلے میں سوتی کپڑے کی ایک چار انچ چوڑی پٹی پڑی تھی، جس کو ایک اضطرابی کیفیت میں سیدھا ہاتھ ڈال کر وہ بار بار کھینچتے تھے۔ کچھ دیر وہ اسی کیفیت میں کچھ بولے بغیر بیٹھے رہے مگر ان کا سیدھا ہاتھ برابر گلے میں پڑی پٹی سے معانقہ کرتا رہا، آخر کو وہ نرمی سے مخاطب ہوئے۔

''ایک رئیس زادہ حضرت لقمان کو طرح طرح کے لذیذ کھانے روز ہی لا لا کر کھلایا کرتا تھا اور جو کچھ آخر میں بچ رہتا اُسے وہ خود کھا لیا کرتا۔ روزانہ ایک سے ایک مزے دار چیز حضرت لقمان کو کھانے کے لئے مل رہی تھی۔ ایک بار وہ رئیس زادہ ایک شاداب خربوزہ لے کر آیا اور اس کی پھانک کاٹ کر حضرت کو کھلائی جو انھوں نے شوق سے کھا لی، وہ پھانکیں کاٹ کاٹ کر کھلاتا رہا اور حضرت لقمان شوق سے کھاتے رہے، جب آخری پھانک بچ گئی تو رئیس زادے نے خود کھانا چاہی مگر زبان پر رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ

وہ تو زہر سے بھی زیادہ کڑوی تھی۔ رئیس زادے کو حیرت ہوئی، حضرت لقمان نے خربوزے کے کڑوے ہونے کی شکایت کیوں نہ کی لیکن حقیقت یہ تھی کہ رئیس زادے کے ہاتھوں انتہائی ذائقہ دار چیزیں کھانے کے بعد حضرت لقمان کو رئیس زادے سے کڑوا خربوزہ کھلانے کی شکایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ حکایت سنا کر پیر و مرشد اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نصیحت کی۔

"جب بھی تم پر کوئی غم نازل ہو تو فوراً استغفار کرو اور پہلے سے زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یہی سلوک کا طریقہ ہے"۔

گل شاہ شیخ سے بے تکلف تھا۔ جھٹ پوچھ بیٹھا۔

"تو کیا بیوی کے غم کے بعد آپ نے استغفار کیا اور حق تعالیٰ کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے؟" جواب ملا:

"استغفار نہیں البتہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ تو ضرور ہوا۔

"گل شاہ کو شیخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ ہونے کی کوئی نشانی نہیں نظر آرہی تھی، وہ مشکوک لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"آپ کس طرح پہلے سے زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے"۔ شیخ نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر اور دونوں بچوں کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

"ان ننھے ننھے دو بچوں کی طرف متوجہ ہو کر"۔ یہ کہہ کر شیخ آبدیدہ ہو گیا۔ بچہ جنانے والی دائی کی بے بسی کی رات یاد آئی، وہ عرس یاد آیا، قوال بار بار تال پر من کنتو مولیٰ کی تان لگا رہا تھا اور شیخ پر آستانے کے آنگن میں حال آگیا تھا۔ فلک مع ستاروں کے گردش میں آگیا تھا۔ شیخ کی بیوی کھپریل کی پرانی چھت کے نیچے دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی، قوال دردانا دردانا کی ورد کر رہا تھا۔ پڑوس کا کم عمر لڑکا جو بطور قاصد شیخ کو بیوی کے درد کی خبر دینے آیا تھا وہ مدہوش شیخ کی کمر سے لپٹا ہوا تھا لیکن شیخ کی آنکھیں پلٹی ہوئی تھیں،

مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، پیر قوال کے سازوں پر تھرک رہے تھے۔ کتنی دیر ہوگئی تھی، زنانے سول اسپتال میں آخری سانس لیتے ہوئے بیوی نے کہا تھا۔

''کاش تم نے تھوڑا سا مجھے بھی چاہا ہوتا۔ تم تو کہتے تھے کہ شیر بننے کے لئے بڑی سوئیاں جھیلنی پڑتی ہیں''۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولی۔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، شاید اتنا ہی کہنے کے لئے وہ ساری زندگی زندہ رہی تھی۔

گل شاہ کچھ دیر شیخ کی صورت دیکھتا رہا پھر یکایک اُسے یاد آیا کہ وہ کس کام سے شیخ کے پاس آیا تھا، جلدی سے پوچھ بیٹھا۔

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ سلیمہ خاتون کا پھر آپ کے پاس کوئی خط آیا ہے''۔

''ہاں۔'' شیخ نے جواب دیا۔

''یہ کیا آپ کی کوئی عزیزہ ہیں؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟''

''میں انھیں نہیں جانتا۔ تم بھی تو کسی سلیمہ کا ذکر کر رہے تھے؟''

گل شاہ نے شیخ کو غور سے دیکھا پھر دونوں آنکھیں پٹپٹائیں اور بولا۔

''اگر یہ وہی بیوہ ہیں تو یہ ایک مینار والی مسجد کی گلی میں رہتی ہیں اور گھر کے باہری کمرے میں شام کو ہومیوپیتھی کا مطب کرتی ہیں۔ میری بھاوج انھیں سے علاج کراتی ہیں''۔

اتنی دیر میں شیخ الماری کھول کر ایک لفافہ نکال چکے تھے جسے گل شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ وہی سلیمہ ہیں، لو پڑھو۔ یہ پہلا لفافہ ہے، دوسرا اسی کی یاد دہانی کے لئے آیا ہے''۔

''محترم!'' گل شاہ نے پڑھنا شروع کیا۔ ''کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ اگر کسی کے بچے کو گود میں لے لیتی ہوں تو پھر واپس دینا نہیں چاہتی۔ زبردستی کی جاتی ہے تو مجھ پر کبھی کبھی ایسا دورہ پڑ جاتا ہے کہ آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے، بچے کے مالک سے ہاتھا پائی کی

نوبت آجاتی ہے لیکن میں بچے کو نہیں چھوڑتی۔ آپ کی طرف سے جو تعویذ عنایت کئے جاتے ہیں، سنا ہے کارگر ہوتے ہیں۔ امید ہے بدنصیب پر توجہ فرمائیں گے، نام کے نیچے ایک مینار والی گلی کا ہی پتا دیا ہوا تھا۔

گل شاہ پوچھنا چاہتا تھا کہ شیخ نے خط کا کوئی جواب دیا یا نہیں مگر بس اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ ''تعویذ ہو یا کوئی دعا، کہئے تو اپنی بھاوج کے ہاتھ بھجوا دوں، وہ دوا لینے جاتی رہتی ہیں''۔ شیخ نے کوئی جواب نہ دیا اور ظہر پڑھنے کھڑے ہو گئے کہ دونوں بچے سو رہے تھے اور ان کی نماز کا وقت بچوں کے سونے پر منحصر ہوتا تھا، ویسے عام طور پر بچے خانقاہ کے بہشتی کی گھر والی کے رحم و کرم پر تھے اور جلدی جلدی بیمار رہنے لگے تھے۔ شیخ کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ دعائیں کام نہیں کر رہی ہیں۔

جب چھوٹے بچے کو سرسام ہوا اور وہ مرتے مرتے بچا تو عشاء سے قبل شیخ صلاح الدین گریبان چاک حالت میں پیرو مرشد کے حجرے پر گیا۔ بڑے ٹوٹے ہوئے دل سے حضرت سے معلوم کرنا چاہا کہ بے ماں کے بچوں کو عزت سے پالنے کی کوئی صورت کیا خانقاہ کے اندر ممکن ہے؟ تو جواب ملا کہ خانقاہ گھر گرہستی اور شادی بیاہ کے خلاف نہیں ہے لیکن خانقاہ آپ کی لڑائی خود نہیں لڑ سکتی البتہ وہ آپ کو لڑنے کے گر بتا سکتی ہے۔ وہ بھی اُس چوہے کی مثال دے کر جو اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے آگے چل پڑا اور اونٹ سے پیچھے پیچھے آنے کا مطالبہ کرنے لگا اونٹ غریب مان گیا اور چلنے لگا، چوہا دل ہی دل میں خوش تھا کہ اونٹ جیسے قد آور جانور کی وہ رہنمائی کر رہا ہے۔ آگے چل کر راستے میں دریا پڑا دریا دیکھ کر چوہے کے ہوش اُڑ گئے اور اس پر اپنی ناتوانی کی حقیقت کھل گئی اور بہت شرمندہ ہوا کہ دریا کیسے پار کرے، یہ دیکھ کر اونٹ نے اس کو ڈھارس دی، کہا کہ وہ اونٹ کے کوہان پر بیٹھ جائے، پانی اونٹ کے گھٹنوں تک ہے آرام سے پار ہو جائے گا۔ اس لئے اے صلاح الدین راستے میں دریا پڑ گیا ہے کوئی اونٹ ڈھونڈو اور بچوں کو اس پر

بٹھادو۔ یہ کہہ کر مرشد نے عشاء کی نیت باندھ لی۔

اگلے کچھ دنوں تک شیخ کے پاس ایسا کوئی لفافہ نہ آیا جس کا خانقاہ میں چرچا ہوتا لیکن دس پندرہ دن بعد ہی یہ خبریں ضرور اندر ہی اندر اڑنے لگیں کہ خانقاہ میں آنے جانے والے کچھ لوگوں نے شیخ کو شام کے وقت ایک مینار والی مسجد کی گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ شیخ سے پُرخاش رکھنے والوں نے ایک گواہ کو بھی پیش کر دیا کہ صلاح الدین ہومیوپیتھی کی ایک ڈاکٹرنی کے پاس جاتے رہتے ہیں اور اس بیوہ عورت سے مطب خالی ہو جانے پر بڑی لگاوٹ سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔

پیرومرشد یہ جانتے تھے کہ خانقاہ میں شیخ کے اتنے لمبے قیام کے بعد بھی ان کے باطن میں کوئی خاطر خواہ روحانی تبدیلی نہیں آسکی ہے لیکن انھوں نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ایک شام اپنے دسترخوان پر شیخ کو مدعو کیا اور آگاہ کیا۔

''اس دنیا کی مثال کشتی کے نیچے بہنے والے پانی کی سی ہے۔ جب تک پانی کشتی کے نیچے بہتا رہتا ہے کشتی رواں رہتی ہے لیکن جب یہی پانی کشتی کے اندر جمع ہونے لگتا ہے تو ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

مشکل سے ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ شیخ کے حاسدوں نے خاصے غوروخوض کے بعد شیخ صلاح الدین کو سلیمہ خاتون سے جوڑتے ہوئے سلیمہ کا خاکہ پیرومرشد کے سامنے اس طرح پیش کیا۔ ہومیوپیتھی کی ڈاکٹرنی ہے، اسکول میں پڑھاتی ہے، موروثی گھر ہے، گوری چٹی، آنکھوں میں بھرا بھرا کاجل، دانت چمکیلے، تیس بتیس کی عمر، گھنی اور کمر تک موٹی چوٹی، ماں باپ پہلے ہی مر چکے، تین چار برس پہلے شوہر قتل ہو گیا، کوئی اولاد نہیں۔ گھر میں تنہا، باپ کے زمانے کا بوڑھا ملازم بازار میں نالے کے کنارے گمٹی میں پان بیڑی سگریٹ بیچتا ہے اور رات کو سلیمہ کے باہری کمرے میں پڑا رہتا ہے کہ گھر میں مرد کی خوشبو بسی رہے، صلاح الدین ہر منگل کو کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے بچے کو گود میں لے کر ڈاکٹرنی کے پاس

دوا لینے جاتے ہیں۔

ایک دن پیر و مرشد نے شیخ صلاح الدین کو اپنے حجرے میں طلب کیا۔ گھور کر دیکھا، پھر سوال کیا۔

''حضرت سلطان العارفین مولانا روم کہاں پیدا ہوئے تھے؟''

''قونیہ میں''۔ شیخ نے جواب دیا۔

''ہاں۔ جمادی الثانی بہ روز شنبہ ۶۷۲ ہجری بوقت غروب آفتاب۔ تم نے اس قطبِ اعظم کی مثنوی پڑھی؟''

''بس تھوڑی بہت'' پیر و مرشد مسکرائے ''ان کی مثنوی کی ایک حکایت سنو۔

''ایک دن سانپ پکڑنے والا ایک برفیلے پہاڑ پر گیا جہاں برفیلی آندھیاں چلتی تھیں اور بیحد ٹھنڈک تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس برف باری میں کچھ بڑے بڑے اژدہے موسم کی مار سے بالکل بے حس و حرکت پڑے تھے جیسے کہ مر گئے ہوں۔ یہ دیکھ کر وہ ایک اژدہے کو مردہ سمجھ کر بغداد والوں کو اس کا تماشہ دکھانے کے لئے اُٹھا لایا۔ جب اژدہا نئی آب و ہوا میں آیا اور آفتاب کی تیز تمازت اس کو نصیب ہوئی تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے زندہ دیکھ کر تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جانتے ہو اس سے کیا سبق ملتا ہے۔

شیخ نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کئی بار سن چکا ہوں میاں! اب تو سب رٹ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفس پر کبھی اعتماد نہ کرو، یہ کبھی بھی جاگ کر تمہیں غرق پشیمانی کر سکتا ہے''۔

''بس یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ خیال رکھنا اس کا''۔ پیر و مرشد نے نصیحت کی، اندر ہی اندر جیسے شیخ کا خون گرم ہونے لگا اس نے خود کو روکا اور ہاتھ جوڑ کر نرم آواز میں بولا۔

''آپ تو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ مردے کو دریا کا پانی ہمیشہ سر پر جگہ دیتا ہے یعنی مردہ پانی کے اوپر تیرتا رہتا ہے لیکن زندہ انسان ہاتھ پیر مارتے مارتے کبھی اوپر اور کبھی

نیچے غوطے کھاتا رہتا ہے پھر غرق آب ہو جاتا ہے اس لئے حق تعالیٰ کی راہ میں اپنے کو مٹادو، فنا کر دو، مردہ بن جاؤ"۔ یہ کہہ کر شیخ احتراماً پیر و مرشد کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عاجزی سے کہنے لگا۔

"یا حضرت! وہ عورت جس کے حوالے سے میرے خلاف آپ کے کان بھرے جاتے ہیں۔ دو سال پہلے اولاد ہونے کے لئے آستانے سے تعویذ لیکر گئی تھی۔ اس کے شوہر نے بیوی کا تو ڈاکٹری معائنہ کرایا جس میں کچھ نہ نکلا مگر خود اپنا معائنہ کرانے سے کتراتا رہا اور ایک دن قتل ہو گیا۔ اب اُس بے اولاد عورت کو کسی کے بچے کو گود میں لینے پر ایک عجیب سا دورہ پڑتا ہے۔ پھر وہ بچے کو گود سے نہیں چھوڑتی، زبردستی کرنے پر بھی نہیں۔ یا حضرت اب لوگ لاش بن کر پانی کی سطح پر تیرنا نہیں چاہتے، ہاتھ پیر مار کر غرق ہونا پسند کرتے ہیں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے پیر و مرشد کے ہاتھ چومے اور وہاں سے نکل گیا۔

کافی دنوں تک شیخ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر ایک دن گل شاہ کو خبر ملی کہ شیخ ایک مینار والی مسجد کی گلی کے نکڑ پر مٹی کا تیل خریدتے دیکھا گیا تھا۔

شاید بیس پچیس دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ قصائی باڑے میں بڑے کے گوشت کی دوکان پر قیمہ خریدتے گل شاہ کو شیخ مل ہی گیا۔ زیادہ بے چینی گل شاہ کو تھی اس لئے اس نے بات اُس پریشان کن خواب سے شروع کی جو اس نے دو راتیں پہلے دیکھا تھا، جس میں شیخ کسی مصور سے ہاتھ پر شیر بنوا رہا تھا پھر شکایت کے لہجے میں اس نے شیخ سے پوچھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ ذکر بھی نہ کیا، چپ چاپ آستانہ چھوڑ کر چلے آئے"۔ جواب میں شیخ خفیف سا مسکرا کر رہ گیا۔

"کر کیا رہے ہیں آجکل؟" گل شاہ نے اگلا سوال کیا۔

"دن میں اسکول میں دفتری کا کام کرتا ہوں۔ شام کو مہرا ٹاکیز میں گیٹ کیپری"۔

گل شاہ چپ رہا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا پوچھے اور کیسے پوچھے۔ جب کچھ بن نہ

پڑا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

"بھائی صلاح الدین۔ یہ سب کیسے ہوا"۔ صلاح الدین اس سوال کے لئے شاید پہلے سے تیار تھا، آہستہ سے بغیر کسی لکنت کے جواب دیا۔

"میرا چھوٹا بچہ ایک بار مطب میں سلیمہ کو دیکھ کر یکایک اس کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا کر اور کلکاری بھر کر زور سے ہمکا تو میں نے بچے کو سلیمہ کی گود میں دے دیا لیکن جب گود سے لینا چاہا تو سلیمہ کی آنکھیں لال ہوگئیں، ہونٹ کانپنے لگے، چہرے پر وحشت برسنے لگی، اس نے بچہ مجھے دینے کے بجائے زور سے بھینچ لیا۔ پھر میں نے بھی بچے کو مانگنے کی ہمت نہ کی، گل شاہ نے اسے آستانے پر آنے کی دعوت دی اور چلا گیا۔

ایک دن سردی بہت تھی شیخ جب مہرا ٹاکیز سے رات ایک بجے آخری شو ختم کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو اس کے پچھلے گھر کی طرح اس گھر پر تالا نہ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا، اس نے کنڈی کھٹکھٹائی تو سلیمہ نے بستر سے نکل کر اور کانپتے بدن سے چل کر دروازہ کھولا اور دانت کٹکٹاتے ہوئے پھر بستر میں چلی گئی۔ بیوی کے مرنے کے بعد شیخ کے لئے یہ نیا تجربہ تھا، شیخ نے جھوٹے برتنوں میں ٹفن ایک طرف رکھا، کھونٹی سے رات کے کپڑے اُتار کر تبدیل کئے جیسے پیر و مرشد تہجد پڑھ کر کپڑے بدلتے تھے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بستر میں ہمت جٹا کر گھستے ہوئے وہ خود سے بڑبڑائے "کم ریاضت نہیں کرنا پڑتی اس مردار دنیا کے لئے"۔

یکایک ان کا چھوٹا بچہ جو اپنے بھائی کے ساتھ دوسرے کمرے میں سلیمہ کے پاس سو رہا تھا، جاگ کر بے تحاشہ رونے لگا۔ آدھی سوئی اور آدھی جاگی سلیمہ گھبرا کر رضائی اُلٹتے ہوئے بیٹھ گئی اور بچے کو جلدی سے گود میں لے لیا۔ شیخ کو دوسرے کمرے میں رضائی کے اندر خیال آیا "پیر و مرشد کی طرح سلیمہ بھی رات کے تھوڑے ہی حصے میں سو پاتی ہے۔ بچہ سونے ہی کہاں دیتا ہے"۔

کچھ دیر بعد شیخ نے ٹھنڈی رات اور ٹھنڈے اندھیرے میں دوسرے کمرے کی طرف کان لگائے جہاں سلیمہ اس کے بچے کو گود میں لئے ہوئے جاگ رہی تھی اور یاد کر رہی تھی کہ قتل سے چند روز پہلے اس کا شوہر جینس اور ٹاپ کا ایک جوڑا اس کے لئے خرید کر لایا تھا ٹاپ ٹی شرٹ کی طرح تھا جس میں آستین نہ تھیں، وہ اُسے شوہر کے سامنے پہن ہی نہ سکی، اس جوڑے کو پہن کر آئینہ دیکھنے کی خواہش کئی بار اس کے دل میں اُٹھ چکی تھی۔
شیخ اپنے بستر پر سوچ رہا تھا کہ سینما ہال میں اسے نوکری موقع سے مل گئی ہے۔ اسے یاد آیا کہ سینما ہال کے مینیجر نے اُسے کئی بار دوڑایا تھا لیکن اس کے مضبوط ہاتھ پیر دیکھ کر انٹرویو میں پوچھا تھا "دارو پیتے ہو، اگر پیتے ہو تو ڈیوٹی کے وقت نہیں پینا، پولیس لے گئی تو سینما مالک چھڑانے پر خرچ نہیں کرے گا۔ پھر مینیجر نے میز کی دراز سے رامپوری چاقو نکال کر اُسے دیا اور ڈیوٹی پر جیب میں رکھنے کو کہا اور یہ آگاہ بھی کیا کہ شو کے ٹائم بدمعاش لوگوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ پھر پوچھا "کسی نیتا کو جانتے ہو؟ دوستی ہے کسی سے؟ تب ہی شیخ کو احساس ہوا تھا کہ شیر جیسی طاقت اور ہمت کے بغیر کام نہیں چلنے کا۔ ملازمت طے ہو گئی اور شیخ مینیجر کے کمرے سے نکلنے لگا تو مینیجر نے اسے ہوشیار کیا "اگر چاقو چل گیا تو یہ نہ بتانا کہ ہم نے دیا ہے۔ ضمانت کرادی جائے گی"۔
پھر شیخ کو گل شاہ کا خواب یاد آیا۔ گل شاہ نے تو صاف کہا تھا کہ بار بار جلتی ہوئی سوئی کے درد کو سہے بغیر شیر کیسے بن سکتا ہے۔ خالی شیر کی دُم بنانے سے کام نہیں چلے گا۔
شیخ صلاح الدین سے گل شاہ کی ملاقات کی خبر جب پیر و مرشد کو ملی تو اُسے اپنے حجرے میں طلب کیا اور شیخ کی کیفیت دریافت کی۔ گل شاہ نے بات اُس خواب سے شروع کی جو اس نے شیخ سے ملاقات کے دو دن پہلے ہی دیکھا تھا۔ اُس نے بتایا کہ شیخ اس کے خواب میں اپنے ہاتھ پر ایک شیر کی تصویر بنوانا چاہتا تھا جو اُس کے اندر شیر جیسی بہادری اور ہمت پیدا کر سکے اور وہ خانقاہ میں دی گئی روحانی ہدایتوں پر عمل کر سکے تاکہ

معرفت کی منزلیں آسانی سے طے کرسکیں مگر جب بھی تصویر بنانے والا سوئی کو آگ میں تپاتا اور شیخ کی کلائی کی کھال پر جلتی سوئی رکھتا تو شیخ درد سے تڑپ اُٹھتا اور پوچھتا "کیا شیر بن گیا؟ معلوم ہوتا کہ ابھی تو دُم ہی بنی ہے، بنانے والا پھر گرم سوئی کھال پر رکھتا تو شیخ پھر تڑپ جاتا اور معلوم کرتا" کیا شیر بن گیا ہے؟ جواب ملتا ابھی تو پچھلا پیر ہی بنا ہے تو جھنجلا کر بنانے والے سے سوال کرتا۔

"اے مصور کیا تو بغیر دُم اور بغیر پیروں کا شیر نہیں بنا سکتا؟"

بس اسی وقت خواب میں ایک سفید پوش بزرگ وارد ہوتے ہیں اور شیخ سے غیض وغضب کے ساتھ بولتے ہیں۔

"اگر تو ایک سوئی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کرسکتا تو شیر جیسے انتہائی تند خو جانور کی تصویر کا مظاہرہ اپنے کمزور ہاتھوں پر کرنے کا ارادہ کیوں کر رہا ہے۔

خواب بیان کر کے گل شاہ نے پیر و مرشد کو بتادیا کہ شیخ کہاں ہے تو پیر و مرشد نے مسکرا کر اتنا ہی کہا۔

"بہت خوب! تو چوہے نے اونٹ تلاش کرلیا"۔

سلیمہ بہت خوش تھی۔ گھر گرہستی کے سارے کاموں میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ جی لگ رہا تھا، کپڑے بدل کر آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کا مشغلہ جسے وہ بھول سی چکی تھی واپس آرہا تھا کہ یکا یک اسے احساس ہوا کہ اندر ہی اندر کسی گہری فکر کے بادلوں نے اس کے چہرے کی بشاشت پر کالی پرچھائیاں سی ڈالنا شروع کردی ہیں۔ اُس دن اس نے شمار کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ گھر میں بچوں کو آئے ہوئے قریب پندرہ روز ہو چکے تھے اور ان کے آنے کے چند روز بعد بچوں کا باپ بھی آگیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" اب کبھی کبھی کوئی بے تکلف پوچھ بیٹھتا ہے۔ اُس دن سلیمہ شیخ کے گھر آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ شیخ سینما کا شو ختم کرنے پر رات ایک بجے گھر آیا تو

سلیمہ اس کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے شیخ کو احساس دلایا کہ سلیمہ ایک بیوہ ہے اور گھر میں اکیلی ہے اور شیخ ایک مرد ہے جو سلیمہ کے گھر میں کسی حق کے بغیر رہ رہا ہے۔ خود شیخ نے اتنے دنوں میں اس عورت کو اس کے بچوں پر جان چھڑکتے ہوئے دیکھا تھا۔ خود اس کے آرام کا خیال رکھا جا رہا تھا، جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کالج جانے سے پہلے کنگھی چوٹی کرتی تو شیخ اسے کنکھیوں سے دیکھتا اور اس کی لمبی گھنی اور سیاہ چوٹی پر دل ہی دل میں فدا ہونے لگتا۔ مرد کے اندر اٹھنے والے اس طرح کے جذبات عورت کی نگاہوں سے چھپے نہیں رہتے۔ ایک دن شیخ کے سامنے جلدی جلدی ناشتہ لگا کر اور اسکول کے لئے تیزی سے تیار ہونے کے درمیان سلیمہ نے شیخ سے پوچھ لیا۔

''آپ کی بیوی کیسی تھی؟''

''جیسی ایک معمولی سی خانقاہ میں احکام حق کی بجا آوری کرنے کی کوشش کرنے والے معمولی ملازم کی ہو سکتی ہے''۔ یہ کہہ کر شیخ کو لگا کہ اس کی مرحومہ بیوی غربت کی حالت میں فرش پر بیٹھی چولہے میں لگی گیلی لکڑیوں کو پھکنی سے پھونک پھونک کر جلانے کی کوشش کر رہی ہے مگر آگ نہیں جلتی تو وہ شیخ کی چھاتی سے لپٹ کر رونے لگتی ہے، پھر کہتی ہے ''کیا تمہارے سینے میں میرے پیار کی آگ بھی گیلی لکڑیوں جیسی ہے۔ کتنی بھی جلانے کی کوشش کروں مگر نہیں جلتی''۔ شیخ نے اپنی بیوی کے بارے میں یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ وہ ایک صابر اور شاکر عورت تھی، کبھی کنگھی چوٹی کا ہوش نہ رہا، اپنے ہاتھ سے موٹے جھوٹے کپڑے سی کر پہن لینے والی عورت تھی وہ۔ یہ سن کر سلیمہ بولی۔

''لوگ کہتے ہیں کہ خانقاہیں مردوں کے لئے ہیں۔ عورتیں اور بچے اولیاء کہاں ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے خانقاہ کیوں چھوڑی؟''۔

سچ تو یہ ہے کہ وہاں میں نے شیر بنانے کی کئی بار کوشش کی مگر سوئیاں بہت تکلیف دیتی تھیں''۔ سلیمہ حیران نظروں سے شیخ کو کچھ سمجھے بغیر دیکھنے لگی تو شیخ نے اس

سوئیوں اور شیر کی حکایت سنا دی۔

سلیمہ نے وہ حکایت سن کر ایک لگاوٹ کی نظر شیخ پر ڈالی اور کلائی کی گھڑی دیکھ کر اور چادر سر پر ڈال کر کالج کے لئے تیز قدموں سے نکل لی۔ اب بچوں کی دیکھ ریکھ کے لئے گھر کے پرانے ملازم بڑے میاں کی نواسی کو گاؤں سے بلالیا گیا تھا۔

دھیرے دھیرے زمین آسمان بدل رہے تھے، خانقاہ جس کے کچے آنگن میں بگولے سے اٹھا کرتے تھے، غیر ملکوں میں آباد پیسے والے مریدوں کی توجہ سے نئے ٹھاٹ اپنا رہی تھی۔ اور وہ سوئی سوئی سی آبادی اب وہاں گھروں گھروں میں شہر کی زہریلی ہوا چپ چاپ گھس آئی تھی کہ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ قصبے کا واحد زنانہ اسکول اب کالج بن گیا تھا، جس بستی میں ایک چیونٹی نہ مرتی تھی وہاں چند برسوں میں کتنے ہی جرائم اور قتل ہو چکے تھے، اسی کے ساتھ گل شاہ کی گمٹی پر ہار پھول اور لوبان خوب بک رہا تھا۔ آستانے پر زائرین کی تعداد بڑھ رہی تھی، شاید دعائیں مستجاب ہو رہی ہونگی۔

دوسرے ہی دن چہرے پر نقلی ناپسندیدگی لاتے ہوئے ناشتے پر سلیمہ نے جلدی جلدی میں شیخ کو آگاہ کر دیا کہ جس خانقاہ میں وہ اب رہ رہا ہے وہ مرد عورت اور بچوں کے لئے ہے اور اس کے اپنے کچھ اصول ہیں"۔ اسی کے ساتھ ساتھ سلیمہ بار بار آئینے کے سامنے کھڑی ہونے لگی تھی۔ بستر پر میگزینوں میں نئے نئے لباسوں اور لپ اسٹکوں کے اشتہار دیکھنے لگی تھی، بار بار اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی لائی ہوئی اور تحفے میں دی گئی جینس اور ٹاپ پہنے، جس میں بانہیں نہیں تھیں لیکن وہ ہمت نہ کر سکی مگر نکاح کے بعد ایک دن سلیمہ پار لر گئی۔ وہاں چوٹی کٹوا کر پٹے رکھوائے، گہری لپ اسٹک لگائی اور شوہر کی لائی ہوئی جینس اور ٹاپ نکال کر پہلی بار وہ لباس زیب تن کیا اور نئے حلئے میں نئے شوہر کے سامنے کھڑے ہو کر ہنسنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "بتائیے! کیسی لگ رہی ہوں؟"۔ شیخ نے دیکھا سلیمہ کی لمبی گھنی اور سیاہ چوٹی غائب تھی۔

شیخ کے گھر کی عورتوں میں نہ کسی نے پٹے رکھے تھے اور نہ کبھی ایسا ننگا پہناوا پہنا تھا۔ اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں تو انھوں نے گردن جھکا لی۔

رات ہوتی ہے تو شیخ تھکی ہوئی سلیمہ کو بستر پر بے خبر سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کچھ اس طرح پھیل گئی تھی جیسے بلّی نے کبوتر کھایا ہو۔ اس کے کٹے ہوئے پٹے منہ پر جھاڑ کے تنکوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ موٹے اور سخت بال تھے، ان کی نوکیں سوئیوں کی طرح اتنی دور سے بھی شیخ کی کھال میں چبھ رہی تھیں۔

شیخ بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھوں سے نیند غائب تھی، وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یکا یک اس کے کان میں کسی نے پوچھا۔

''تم کسی تکلیف کو چھپا رہے ہو'' شیخ نے کوئی جواب نہ دیا، کہ کوئی جواب تھا بھی نہیں۔ لیکن تکلیف تو تھی۔ اور اتنی تھی کہ نیند غائب تھی۔ اسے یاد آیا ابھی کل ہی ایک شرابی لفنگا سینما کے گیٹ میں زبردستی گھسنے پر روکے جانے کے سبب شیخ کو ماں بہن کی گالیاں دے گیا اور شیخ جیب سے چاقو نہ نکال پایا۔ اس کی تکلیف بھی کم نہ تھی۔ بار بار اس کی نظریں سلیمہ کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی لپ اسٹک پر پڑتیں تو وہ تڑپ اٹھتا، آخر کو جھنجلا کر اس نے تولیئے سے سلیمہ کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کے داغ کو صاف کرنے کی کوشش کی تو اس کے کان میں جانی بوجھی سی ایک آواز آئی۔

''یہ صفائی کب تک کرو گے۔ کلائی پر شیر بنوا لو''۔

اسے یاد آیا کہ کشتی کو رواں رکھنا ہے تو پانی اس کے نیچے ہونا ہی چاہیے، تب ہی اس کو لگا کہ اس کے چاروں طرف موجیں مارتا سمندر ہے اور وہ کشتی میں ہے تو وہ بستر پر نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ کتنی جلتی سوئیوں کے درد سے شیر بنے گا، ہزار یا دس ہزار؟ شیخ اس کا قیاس کرتا رہا اور چپکے چپکے ایک انجانے خوف اور وسوسے کو سینہ سے لگائے بغیر آنسوؤں کے روتا رہا کہ نیند نے ترس کھا کر اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ●●

حنوط کی ہوئی تلوار

نوجوان طالب علم اُس رنگ آلود تلوار کو جو مکان کی نیو کھدوانے کے دوران ملی تھی ،اپنے سرہانے رکھ کر سو گیا۔

گہری نیند میں اُس نے ایک خواب دیکھا۔

دیکھا کہ زرہ بکتر پہنے گٹھیلے جسم کے ایک گھڑسوار، آہنی خود میں سر اور ماتھا چھپائے سفید گھوڑے کی لگام تھامے،گھوڑے کی پیٹھ پر شان سے بیٹھا اُسے گھور رہا ہے۔
نوجوان چونکا اور تکیے سے سر اُٹھا کر حیرت کے ساتھ اُن خنگ سوار سے مخاطب ہوا۔

''تم کون ہو بھئی؟''

''میں شیر شاہ سوری ہوں اور تمہارے سرہانے رکھی تلوار میری ہے''۔

نوجوان طالب علم گھبرا کر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔اپنے حواس سنبھالے اور کہا۔

''تم شیر شاہ سوری ہو سکتے ہو، یہ تلوار بھی تمہاری ہو سکتی ہے۔خواب کے بجائے اگر تم حقیقت میں گھوڑا لے کر میرے کمرے میں آجاؤ تو ایک دن کے اندر تمہیں مع گھوڑے کے حنوط کر کے کسی میوزیم میں ڈال دیا جائے گا''۔

''میں یہی چاہتا ہوں۔تاریخ میں میری حیثیت ہی کیا ہے،تم لوگوں نے اتنی نیشنل ہائی وے بنا ڈالی ہیں کہ میری ایک ٹوٹی ماری گرانڈ ٹرنک روڈ کی کوئی اوقات ہی نہیں رہ گئی''۔

نوجوان طالب علم کی آنکھ کھل گئی۔ٹٹول کر دیکھا تلوار سرہانے رکھی تھی۔پلنگ سے اُٹھ کر فرش پر گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان تلاش کیئے مگر ٹائلس کے پکے فرش پر بھلا نشان کہاں ملتے۔

نوجوان تاریخ کے مضمون میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ ایک دن وہ اُس تلوار کو بڑے جتن سے چھپا کر اپنے گائڈ پروفیسر وائی کے پاس لے گیا اور اکیلے میں بڑی رازداری کے ساتھ وہ تلوار دکھائی۔ پروفیسر نے غور سے تلوار کا معائنہ کیا، پھر کمپیوٹر پر قدیم آلات جنگ کے ماہرین کے نام تلاش کئے اور اپنے شاگرد کو ہدایت کی کہ وہ اس تلوار کو پروفیسر وائی کے پاس کچھ دنوں کے لئے چھوڑ جائے۔

چند ہی دنوں میں قدیم جنگی آلات کے ماہر کے ذریعے پروفیسر وائی کو خبر ملی کہ تلوار کا لوہا، لوہے کا وزن، لوہے پر رکھی جانے والی دھار اور تلوار کی بناوٹ کا تعلق قرون وسطٰی کے زمانے کا ہے اور تلوار پر بنے نشانات مغل عہد کے کسی شاہی اسلحہ ساز سے تعلق رکھنے کی توثیق بھی جلد ہو جائے گی۔ پروفیسر وائی نے اپنے طالب علم کو مشورہ دیا کہ اب وہ اُس تلوار کو کچھ دنوں کے لئے بھول جائے کیونکہ ضروری چھان بین کے بعد ممکن ہے کہ کوئی اچھی خبر ملے۔ ویسے تلوار پر ایک نشان بہت دلچسپ ہے۔

ایک رات طالب علم کو سوتے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی پُراسرار آوازیں سنائی دیں۔ وہ آوازیں دھیرے دھیرے اُس کے سرہانے تک آ کر رُک گئیں۔ سوتے میں ہی طالب علم نے پوچھ لیا۔

''کون ہے؟''

''شیر شاہ''۔ جواب ملا۔ طالب علم نے اُسی نیند میں ہی سوال کیا۔

''کیوں بار بار آ جا رہے ہو؟ کیا وہ تلوار واقعی تمہاری ہی ہے؟''

''ہاں تلوار میری ہے''۔ جواب آیا۔

''کوئی ثبوت؟''

''ہاں ثبوت ہے۔ تلوار کی نوک پر سوری حکمرانوں کے پرچم کا نشان بنا ہوا ہے جسے عام بصارت سے دیکھ پانا تھوڑا مشکل ہے۔ تمہارے یہاں کے ماہرین اس نشان کو پہچانتے بھی ہیں۔ طالب علم کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''ماہرین اس کی حقیقت جاننے کے کام میں لگے ہیں، تھوڑا صبر کرو''۔

صبح ہوئی تو طالب علم نے بستر پر سے اُٹھ کر کمرے کے فرش پر سب سے پہلے گھوڑے کی لید تلاش کی مگر فرش بالکل صاف ستھرا تھا۔ طالب علم دیر تک اس تازے تازے خواب کے بارے میں گردن لٹکائے سوچتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد طالب علم کو خیال آیا کہ وہ اپنے پروفیسر کو اس خواب کے بارے میں بتائے۔ اس نے موبائل پر بات کرنا چاہی لیکن پھر رازداری کے خیال سے فون پر بات کرنے کا ارادہ بدل دیا اور پروفیسر سے ملنے کا وقت لے کر ان کے گھر چلا گیا۔ پروفیسر وائی کو طالب علم کی زبانی یہ معلوم ہو کر کوئی حیرت نہ ہوئی کہ تلوار کی نوک پر سوریوں کے پرچم کا نشان بنا ہوا ہے، وہ مسکرا کر بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ای میل پر بھی یہ خبر آگئی ہے کہ تلوار کی نوک پر بنا وہ نشان پہچان لیا گیا ہے''۔

کئی دن گزر گئے۔ طالب علم شیر شاہ سوری اور اس کی تلوار کو لگ بھگ بھول ہی گیا تھا کہ ایک رات خواب میں شیر افگن صاحب پھر تشریف لائے۔ چہرے پر فکر کے بادل تھے۔ انھوں نے تھکی ہوئی آواز میں طالب علم سے تلوار انھیں واپس کر دینے کا مطالبہ کیا۔ طالب علم نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ چند تاریخ دانوں کے ذریعہ اس تلوار کی تحقیق کی جارہی ہے۔ یہ سن کر شیر شاہ کا چہرہ تمتما اُٹھا، غصے سے بولے۔

''میری مٹی خراب کرنے کا حق بھلا تم کو کس نے دیا؟''

''کیا مطلب؟'' طالب علم سٹپٹا گیا۔ شیر شاہ جھنجھلا کر بولے۔

''تلوار کی شان تو اس وقت تک ہے جب تک اُس کے جوہر میں سفاکی اور دھار میں غضب کی کاٹ ہو''۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سے اُترے، طالب علم کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑے ہوئے، طالب علم گھبرا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ شیر شاہ نے اس کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھا پھر شفقت سے کہا۔

''وہ تلوار اب بچوں کے کھیلنے والی ٹین کی ایک تلوار ہے، اس کی نمائش کر کے مجھے رُسوا نہ کرو''۔ یہ کہہ کر ان کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ طالب علم کی گھبرا کر آنکھ کھل گئی۔ وہ

پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

تیسرے پہر کو یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں تاریخ کے ایک ماہر مہمان اسکالر کی تقریر تھی، طالب علم بڑے شوق سے تیار ہو کر مالویہ ہال پہنچا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ڈائس کی جانب سے آواز سنائی دی۔

"ہمارا آئین۔ ہمارا Constitution شروع سے ہی ہندو دشمن ہے"۔ جملہ ختم ہوتے ہی پورا ہال تالیوں سے گونج پڑا۔ شور تھما تو مقرر اور زیادہ پُر اثر لہجے میں بولا۔

"ہم پوچھنا چاہتے ہیں۔ کوئی ہمیں بتائے ایمانداری سے کہ ملک کی یگانگت، بھائی چارے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو کس نے تباہ اور برباد کیا ہے؟ آخر وہ کون ہے جس نے ملک میں بیروزگاری، بھوک اور بھرشٹاچار کو پھیلایا ہوا ہے۔ جواب ہے کہ ان میں سے ہر برائی کا ذمہ دار ہمارا سمویدھان ہے، سچ پوچھئے تو انگریزوں کی دو سو برس کی حکومت نے ہم کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ آزادی کے وقت بنائے گئے ہمارے Constitution نے۔ یہ بہت بڑا جھوٹ ہے کہ ہماری ملی جلی تہذیب ہے، یہ جھوٹ بار بار بولا گیا اور اب بھی بولا جا رہا ہے۔ ہماری سنسکرتی تو ایک انوکھی تہذیبی اکائی ہے جس میں پراچین بھارت کی آتما براجمان ہے"۔

طالب علم نے بور ہو کر ہال میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ آگے کی قطار میں تاریخ کی طالبہ کامنا نائر بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھیں اِدھر اُدھر چلا رہی تھی۔ اس نے چند روز پہلے ہی اپنی تھیسس جمع کی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کامنا کو مخاطب کیا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں کینٹین کی میز پر بیٹھے تھے۔ کامنا پوچھ رہی تھی۔

"یار کوئی بھی کلچر کیا خالص ہے؟ دراصل خالص کو تلاش کرنا ہی سچائی کو زخمی کرنا ہے"۔

اس کے جی میں آئی کہ وہ کامنا کو تلوار کے معاملے میں اپنا رازدار بنائے لیکن کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

اگلے چند ہی روز میں پروفیسر وائی نے طالب علم سے فون پر پوچھا۔
"یہ بتاؤ کہ تمہیں اس تلوار کی واپسی کی کوئی جلدی تو نہیں ہے؟"
"نہیں سر! مجھے کیا جلدی ہو سکتی ہے"۔
"میں تلوار کے ہی سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ میرے بارے میں ڈپارٹمنٹ میں کوئی پوچھ تاچھ نہ کرنا"۔ یہ کہہ کر پروفیسر نے فون کاٹ دیا۔
طالب علم ایک رات سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ پروفیسر کی کال تھی۔
"ہلو سر!"
"کیسے ہو؟"
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کہاں ہیں سر؟"
"یہ غیر ضروری سوال ہے"۔ پروفیسر کا جواب آیا۔ پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔
چیزوں کی شکل و صورت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان پر سورج کی روشنی کس زاویئے سے پڑ رہی ہے۔ اس لئے ابھی جو چیز جیسی دکھ رہی ہے کچھ دیر بعد وہ ویسی نہیں دکھتی"۔ طالب علم دو پل سوچ کر بولا۔
"سر یہ بات آپ کس سلسلے میں کہہ رہے ہیں؟"
"تلوار کے سلسلے میں" جواب آیا۔ قبل اس کے کہ طالب علم کچھ بولتا، فون کٹ گیا۔
کچھ ہی دن گزرے تھے کہ انگریزی کے ایک بڑے اخبار میں طالب علم کے گائڈ پروفیسر وائی کے حوالے سے ایک خبر چھپی، جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پروفیسر کو حنوط کی ہوئی ایک تلوار دستیاب ہوئی ہے جس کا تعلق مغلوں کے عہد سے مانا جا رہا ہے۔ تلوار پر سوری حکمرانوں کے پرچم کا نشان بھی صاف بنا ہوا ہے۔ تاریخ دانوں کے درمیان تلوار کی مزید تحقیق کا کام جاری ہے، طالب علم یہ خبر پڑھ کر سناٹے میں آگیا۔ سوچتا رہا اس نے پروفیسر کو جو تلوار دی تھی، وہ تو سنہرے نقش و نگار کے قیمتی نیام کے اندر رکھی تھی۔ یہ حنوط کی ہوئی تلوار کونسی ہے۔ طالب علم نے بہت کوشش کی کہ اس کے گائڈ سے اس کی بات

ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

چند ہی دنوں میں اخباروں میں حنوط کی ہوئی تلوار کو لے کر ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ کہا گیا حنوط تو مردہ کو کیا جاتا ہے، تلوار کیوں حنوط کی گئی۔ کیا تلوار بھی مردے کے جسم کی طرح سڑ سکتی ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ حنوط کے لئے استعمال کیئے گئے مسالے احرام مصر کی چیزوں اور مسالوں کی چوری کرنے والے پیشہ ور ماہرین کی ایسی ملاوٹوں سے تیار کیے گئے ہیں جو لوہے کو زنگ کھانے سے بچاتے ہیں۔

مگر ایک صبح کے اخباروں کی ایک خبر نے ہلچل مچادی۔ وہ خبر یہ تھی کہ حنوط شدہ تلوار کے ہاتھی دانت سے بنے نفیس اور منقش قبضے پر ایسے گل بوٹے بنے ہیں جنھیں غور سے دیکھنے پر دیوناگری کے حروف بن جاتے ہیں، ان حرفوں سے جو عبارت بنتی ہے وہ ہے 'پرم ویریہ مہارانا پرتاپ سنگھ'۔ یہ خبر پڑھتے ہی طالب علم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ بڑبڑایا۔

''اکبر۔ راجپوت۔!! ہلدی گھاٹی۔

اس خبر کے چھپتے ہی تاریخ دانوں نے یہ کہہ کر آسمان سر پر اُٹھالیا کہ جس علاقے سے تلوار ملی ہے وہاں مہارانا پرتاپ کی کسی سے جنگ کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس بیان کے جواب میں کہا گیا کہ جنگ خواہ نہ ہوئی ہو لیکن یہ تو ملتا ہے کہ مہارانا اس علاقے سے گزرے تھے۔ ممکن ہے لٹیروں نے گھر لیا ہو اور اس حملے میں مہارانا نے اس کے سردار کو مغلوب کر کے ہتھیار ڈلوا دیئے ہوں۔ اور وہ سردار سوری خاندان کا رہا ہو۔

پھر خبر آئی کہ کچھ ماہر تاریخ دانوں کی ایک کمیٹی بنائی جارہی ہے جو مغلوں کے چھکے چھڑا دینے والے اس مہان یودھا کی تلوار کو اتنی عقیدت اور احترام کے ساتھ سینہ بہ سینہ حفاظت کرنے والے ونش کا پتا لگائے گی۔

ایک دن پھر اچانک طالب علم کے پاس پروفیسر کا فون آیا۔

''بس اب میرے کام کے ختم ہونے میں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، تلوار کے بارے میں تم کسی سے کوئی ذکر نہ کرنا''۔

پچھلی کچھ راتوں سے بار بار طالب علم کو رات گئے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی گھوڑے کی ٹاپیں باہر کے دروازے تک آکر رُک گئی ہوں۔طالب علم دروازہ کھولتا تو وہاں کوئی نہ ہوتا۔لیکن ایک رات کال بیل بجنے پر جب طالب علم نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کے گائڈ کھڑے تھے۔وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بولے۔

''میں کل شام کی فلائٹ سے احمد آباد جا رہا ہوں۔مہارانا کی تلوار ہیرے کے ایک بیوپاری نے خرید لی ہے''۔

''خرید لی ہے؟ کتنے میں'' طالب علم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ڈیڑھ کروڑ میں۔میں نے اس تلوار پر کتنا پیسہ صرف کیا ہے؟ کہاں کہاں گیا ہوں اور کیا کیا کیا ہے؟ یہ میں تم کو کیا بتاؤں لیکن وہ ٹین کی تلوار تمہاری تھی۔سوچ سمجھ کر اپنا حصہ مانگ لینا، احمد آباد سے واپس آکر دے دونگا''۔پروفیسر جلدی میں تھا چلا گیا۔ طالب علم کو دیر رات ایسا محسوس ہوا کہ باہر دروازے پر کوئی آہٹ ہوئی ہے۔طالب علم نے اُدھر کان لگائے۔ایسا لگا کہ دروازے کے پٹ کو کسی نے باہر سے ہلایا ہو۔طالب علم بستر پر بیٹھ گیا۔کون ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا اور ایک بار پھر دروازے کی جانب کان لگا لئے۔وہ سہما ہوا تھا۔اس کا بدن اندر سے کپکپا رہا تھا۔کیا وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہے؟ اس نے سوچا۔اس کو بھاری بوٹوں کی باہر چلنے کی آواز محسوس ہوئی۔اسے لگا کہ وہ پولیس کے بوٹوں کی آواز ہے۔اس نے گھبرا کر سرہانے سے موبائل اُٹھایا، کامنا کا نمبر لگایا۔دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر کامنا کی نیند میں ڈوبی آواز آئی ''ہلو''۔اس نے سوچا وہ کامنا کو بتائے کہ گھر کے باہر شاید پولیس کھڑی ہے۔وہ فوراً آجائے اور ان سے پوچھے کہ وہ کیوں آئے ہیں۔

اُس نے کامنا کو فون لگایا تو بغیر کسی تمہید کے وہ بولی ''یار اردو کی ایک کتاب پڑھ رہی ہوں۔تم بھی سنو۔لکھا ہے

''تاریخ اور عورت دونوں کے خواب اور حقیقتیں لگ بھگ ایک سی ہوا کرتی ہیں، عورت کی طرح تاریخ کو بھی سجنے اور سنورنے کا شوق ہوتا ہے۔آئینہ دیکھ دیکھ کر مند مند مسکانے کا شوق۔تاریخ کی طرح عورت بھی اپنی خواب گاہ میں پھولوں کی سیج سجاتی ہے،

چھت پر ٹنگے رنگ برنگے جلتے بجھتے قمقمے جنھیں یکا یک گل کر کے تاریکی بکھیر دینے والا بٹن عورت کی طرح تاریخ بھی ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ تاریخ بعض عورتوں کی طرح حرافہ، نیچ اور چھنال بھی ہوا کرتی ہے جو اکثر تلوار کی نوک پر خلافِ مرضی اپنے ساتھ زبردستی ہو جانے والے زنا پر بظاہر شور مچانے اور واویلا کرنے کا ناٹک کرتی ہے مگر اندر ہی اندر اس شہوت افروز بربریت کا لطف ہم بستری سے کبھی نہ تھکنے والے جسم میں دیر تک محسوس کرتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ناگا ساکی پر تاریخ کی سنسنی خیز حالتِ جماع کے نقطۂ انزال کے وقت ہی بم گرایا گیا تھا۔

صبح ہوئی تو اس نے جلدی سے شیو بنایا، کپڑے بدلے۔ اسے یاد آگیا تھا کہ اس کے تھانے کے ایس آئی اس کے باپ کے پرانے دوست ہیں اور اب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ تھانے پہنچ کر اس نے ایس آئی سے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے یہ ٹوہ لینا چاہی کہ اس کے خلاف تھانے میں کوئی ایف آئی آر تو درج نہیں کی گئی ہے۔

رات آتے آتے وہ بری طرح سے ذہنی اور جسمانی طور پر تھک گیا تھا اس لئے بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن رات کے دو پہر گزرنے کے بعد جب کمہاروں کی بستی کے کتے زور زور سے بھونک رہے تھے تو یکا یک طالب علم کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا کہ باہر کچھ لوگ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ دروازے پر کچھ ایسا ارتعاش ہوا جیسے اس کے پٹ پر کھریا مٹی سے کوئی نشان لگا رہا ہو۔ طالب علم خوفزدہ ہو کر بستر سے کوئی آہٹ کئے بغیر اُٹھا، دبے قدموں سے دروازے کے پاس آیا۔ ایک کان دروازے کے پٹوں پر رکھ کر باہر کی آہٹ لینے کی کوشش کی۔ یکا یک اسے کسی گھوڑے کی تھکی تھکی ٹاپوں کی مری مری سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کچھ فاصلے سے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک پل بعد وہ ٹاپوں کی مضمحل آوازیں دروازے کی دہلیز پر آکر رک گئیں۔ پھر اسے صاف لگا کہ کوئی گھوڑے پر سے اترا۔ گھوڑے سے اترنے کی زمین پر دھمک نے دہلیز کو بھی خفیف سا لرزا دیا تھا۔ اسی وقت دروازے پر کسی کے ہاتھوں کا پُر تکلف دباؤ محسوس ہوا جیسے دھکا دینے والا بادلِ ناخواستہ ایسا کر رہا ہو۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ طالب علم سانس

رو کے دروازے سے لگا اندھیرے میں پٹوں کو گھور رہا تھا۔ یکا یک اس کے کانوں نے کچھ سنا۔ بالکل صاف سسکیاں لینے کی آوازیں تھیں۔ بلاشبہ کوئی دروازے کے پٹوں پر اپنا ماتھا ٹکائے سسکیوں سے رو رہا تھا۔ دروازے کے باہر اتنے قریب سے آنے والی آوازوں کو سن کر وہ لرز گیا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس نئی صورتِ حال سے بھاگنے کا اس میں یارا نہ تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولنا چاہا۔ یکا یک اس لرزا دینے والے سناٹے میں موبائل کی پُراسرار موسیقی نے اس کے ہاتھ روک دیئے۔ لپک کر فون اُٹھایا، دوسری طرف کامنا تھی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارا پروفیسر تم کو ڈر پوک سمجھتا ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ ابھی تک تم نے یہ نہیں سیکھا ہے کہ زندگی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کیسے چلا جاتا ہے۔ زندگی کو اپنا دوست بنا کر اور اس کے دوست بن کر چلو۔ میں پروفیسر کے ساتھ سو چکی ہوں اور تمہاری دوست بھی ہوں۔ مجھ سے تم اگر اپنے خوف چھپاؤ گے تو پھر اپنے خواب بھی نہ بتا پاؤ گے''۔

طالب علم پسینے سے تربتر ہو چکا تھا، اس کا حلق اتنا سوکھ چکا تھا کہ وہ کچھ بھی بول نہ پایا۔ اس کے کان پھر دروازے کی طرف لگ گئے۔ پھر وہی سسکیاں! کسی شکستہ اور مجروح شخصیت کی تھکی تھکی سسکیاں۔ طالب علم دیوانوں کی طرح دروازے کی طرف جھپٹا۔ کچھ بھی سوچے بغیر تیزی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ پسینے سے بھیگے جسم پر ٹھنڈی ہوا کا ایک تھپڑ پڑا، وہاں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن دل موس دینے والی سسکیوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ دور سے نہیں بلکہ بہت پاس سے۔ اتنی قریب اور صاف جتنی دھڑکتے ہوئے دل کی آواز کبھی کبھی کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ اس نے اپنا لرزتا اور کانپتا ہاتھ سینہ پر رکھ کر گردن جھکالی۔

●●

اپنے اپنے توتے

پوپلے منہ، سفید بالوں اور جھکی کمر والی دو بڑھیاں پاس پاس رہتی تھیں، ایک دیوار کے ادھر اور دوسری دیوار کے اُدھر۔ ایک کا نام گلابو تھا اور دوسری کا شتابو۔ بیچ کی دیوار اونچی نہ تھی زمین پر بالٹی اوندھا کر دیوار کے سہارے کھڑے ہونے پر دوسری طرف گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ دیکھا جانا کوئی دشوار نہ تھا۔ کون آیا، کون گیا، گلابو کیا کر رہی ہے ان سب باتوں کی خبر ایک دوسرے کو رہا کرتی تھی۔

گلابو کے پاس ایک زنگ خوردہ پنجرہ تھا جس میں نہ جانے کب سے ایک توتا پلا ہوا تھا، دن بھر بنی جی بھیجو، پکارتا یا سیٹیاں بجاتا مگر بولتا صاف تھا۔ شتابو کے پاس ایک شریف النفس مینا تھی جس کو بڑھیا دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے جلی کٹی سنایا کرتی مگر مینا ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی مگر جیسے ہی بڑھیا گھر سے باہر نکلتی مینا پنجرے سے آواز مارتی "جا رہی ہو۔" بڑھیا جواب دیتی "چل ہٹ مردار۔"

گھوڑوں کا کاروبار کرنے والے ایک رئیس کی بیوی نے دونوں بڑھیوں کو اپنے میاں کے لق و دق اصطبل کے ایک کمرے میں درمیان میں دیوار کھینچ کر اس لئے ڈال لیا تھا کہ وقت بے وقت کام آئیں گی۔ بڑھیاں گھاگ تھیں، جانتی تھیں کہ ڈیوڑھیوں کی شادابی دھیرے دھیرے مرجھا رہی ہے اس لئے تن بہ تقدیر جو حصے میں آرہا تھا اسی پر شکر ادا کرتیں۔

کچھ دنوں میں شتابو کو یہ سن گن لگی کہ گلابو کے گھر میں چلتی پرزہ اور بدنام زمانہ بی جمالو کا آنا جانا روز کا معمول بن گیا ہے۔ بی جمالو معمولی چیز نہ تھیں، آسمان میں ٹکلی لگاتی تھیں۔ ایک دن جب جمالو کے آنے کی آہٹ ملی تو شتابو جھٹ دیوار سے بالٹی اوندھی ٹکا کر کھڑی

ہو گئیں اور اس پار کا بھید لینے لگیں، دیوار کے پاس ہی کھاٹ بچھائے گلابو اور جمالو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

گلابو: اے بہن جمالو کوئی راستہ بتاؤ کہ ہمارا بھی مقدر پلٹے اور اچھے دن آئیں، کہا تھا سوچ کر بتاؤں گی۔ بھلا کچھ سوچا"؟

جمالو: سوچا تو ہے۔

گلابو: کیا سوچا؟ بتاؤ نا۔

جمالو: تمہارے پاس ایک توتا ہے۔

گلابو: طوطا؟ ہے تو مگر وہ کس کام کا؟

جمالو: وہی کہہ رہی ہوں اُسے کام پر لگاؤ۔

گلابو: زیادہ سے زیادہ بنی جی بھیجو سکھا سکتی ہوں، سو وہ دن بھر رٹتا رہتا ہے۔

لمبی بات چیت کے بعد جمالو اور گلابو میں یہ طے پایا کہ بہت سوچ سمجھ کر توتے کو ایسے سبق سکھائیں گی جن سے چار پیسے کمائے جاسکیں۔ وہ لوگ جو ڈوبتے میں تنکے کو بھی سہارا سمجھ کر پکڑ لیا کرتے ہیں، ایسے لوگ توتے کو غیبی طاقت کا مالک سمجھنے لگیں گے۔ مرادیں مانگیں گے، چڑھاوے چڑھائیں گے، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں شابو جمالو پر صدقے قربان ہو گئی۔ تب جمالو نے شرط رکھی۔ جب توتے کو سکھائے سبق کچھ پھل دینا شروع کر دیں تو ہر روپے پر بیس پیسے کی حقدار بی جمالو بھی ہو جایا کریں گی۔ یہ سن کر شابو کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ دن رات گلابو کے آنگن کی طرف کان لگے رہے لیکن بی جمالو اندر کے کمرے میں توتے کو جو ریاض کراتیں اس کا کچھ پتا نہ چلتا، کچھ ہی عرصے میں گلابو کے یہاں کیا ہو رہا ہے اس کا پتا لگانے کے لئے شابو آخر بے صبری سے اس کے گھر پہنچ ہی گئیں، جیسے ہی انھوں نے ٹوٹے پھوٹے برآمدے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک دھنی میں لٹکے پنجرے کی طرف سے آواز آئی۔

"آؤ خوش نصیب آؤ" شابو حیران پنجرے کے پاس جا کر بت بنی کھڑی رہ گئیں کہ

توتا گردن کے بال پھُلا کر بولا۔

''مانگو۔ ملے گا۔ مانگو ملے گا''

شابو نے دیکھا کہ گلابو کے بدن کا لباس بھی توتے جیسا ہو گیا ہے یعنی سبز جمپر پر لال دوپٹہ۔ کچھ دنوں بعد گلابو کے گھر سے لوبان کی خوشبو آنا شروع ہو گئی۔ توتے کا پنجرہ بیلے کے ہاروں سے ڈھکنے لگا۔ اب توتے کو نیا سبق سکھایا گیا تھا۔

''بیٹھیے۔ میاں مراد پوری کریں گے''۔ یا پھر توتا آنے والوں کو ڈانٹتا۔

''واپس جاؤ، کچھ نہیں ملنے کا''

شابو نے شدت سے محسوس کیا کہ گلابو کا لباس ہی نہیں اس کی آواز بھی توتے جیسی کڑ کیلی اور پتلی سی نکلنے لگی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بھی توتے کے رنگ کا رنگوا لیا تھا جبکہ اصطبل کے مالک اسمٰعیل خٹک نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر کہیں بھی کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ لیکن دروازے کا رنگ ہی نہیں بدلا گیا تھا بلکہ دروازے کی چوکھٹ پر ایک بورڈ بھی نصب کیا گیا تھا جس پر لکھا تھا ''طوطا بابا آشرم''۔ شابو کو چین کیسے ملتا۔ برقع اوڑھ اسمٰعیل خٹک کی بیوی سے بھید لینے پہنچ گئی۔ وہاں اس کو بیگم خٹک سے جو کچھ معلوم ہوا اس سے اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مثلاً یہ کہ دروازے رنگنے اور بورڈ لگانے کی اجازت خود بیگم خٹک نے گلابو کو دی ہے۔ یہ کہ وہ لاولد تھی لیکن توتے کی کرامات نے اس کی جھولی بھرنے کا معجزہ ڈاکٹرنی کے ذریعے سنا دیا ہے، یہ ماجرا سن کر شابو الٹے پیروں گلابو کے گھر گئی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ برآمدے میں لکڑی کے دو کشادہ تخت بچھے ہوئے تھے جن پر بے داغ سفید چاندنی اور گاؤ تکیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ کچے آنگن میں زمین برابر کر کے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ قلعی کیا ہوا ایک نقشی پاندان جو کم سے کم پانچ کلو تانبے کے وزن کا رہا ہو گا تخت کے ایک کونے پر آنے والی بیبیوں کی ضیافت کے لئے رکھا تھا جسے شابو نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ بیگم خٹک کے گھر کا ہے۔ شابو کی نظر اخبار کے اس اشتہار پر بھی پڑی جس پر لکھا تھا۔

"مراد مانگنے والے مایوس نہ ہوں، تو تابابا سے مانگیں، اصطبل نزد چھاؤنی"۔

شابو جب گھر سے باہر جھانک کر دیکھتی تو دن بہ دن اسے میدان میں اسکوٹروں موٹر سائیکلوں اور کاروں کی بھیڑ بڑھتے ہوئے دکھائی دیتی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اسمٰعیل خٹک کے کارندوں نے سواریوں سے اس زمین پر گاڑیاں وغیرہ کھڑی کرنے کا کرایہ لینا شروع کر دیا۔ بی جمالو کو دھیرے دھیرے یہ اندازہ ہونے لگا کہ توتے کی مقبولیت کچھ اتنی بڑھ رہی ہے کہ شہر کے بڑے لوگوں کے دانت اس پر لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ اسمٰعیل کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی۔ مہرن سیانی اور سمجھدار تھی گلابو کے گھر پیسے کی ریل پیل دیکھ کر وہ حیران تھی۔ ایک دن مہرن کو گلابو مال میں مل گئی۔ ٹی وی کا جدید ترین ماڈل گلابو نے اسی وقت خریدا تھا جو پیک کیا جا رہا تھا۔ گلابو جینس اور ٹاپ میں تھی۔ پیروں میں اٹلی کی قیمتی نوک دار ہیل والی سینڈل تھی۔ مہرن اس کے آگے ملازمہ لگ رہی تھی۔ مہرن کو دیکھتے ہی اس نے فریاد کی۔

"بی بی تمہارے باپ نے میری آمدنی بند کر دی۔ تھوڑے سے پیسے دیکر توتے کے حقوق لکھا پڑھی کر کے اپنے نام لکھوا لئے۔ میں ان پڑھ بڑے لوگوں کے جھانسے میں آ گئی۔ یہ کہہ کر گلابو چل دی۔ مہرن اس کی چال کو غور سے دیکھتی رہی۔ اونچی ایڑی کی سینڈلوں نے اس بڑھیا میں جس کا سر قیمتی شیمپو سے دھلکر چمک رہا تھا میں ارسٹو کریسی کی ایسی خوشبو پیدا کر دی تھی کہ مہرن اسے محسوس کر کے دنگ رہ گئی۔

ایک دن مہرن کچھ بیمار پڑ گئی تو شب باشی کے لئے اس کے پاس رہنے کے واسطے شابو کو گھر بلا لیا گیا۔ شابو رات مہرن کے کمرے میں لیٹی تھی برابر کا کمرہ مہرن کے باپ کا تھا جہاں اس وقت لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ شابو نے دیکھا کہ اس آوک جاوک کے درمیان بی جمالو بھی اسمٰعیل خٹک سے ملنے گئی اس وقت مہرن سو چکی تھی شابو نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ بیگم خٹک کہہ رہی تھیں۔

"جمالو۔ تم اسمٰعیل کو اپنا مقدمہ بتاؤ"

جمالو: کیا بتاؤں حضور۔گلابو اور میرے درمیان طے ہوا تھا کہ جب توتے بابا کا کام چل نکلے گا تو ان پر جو بھی نقد چڑھاوا چڑھے گا اس پر فی روپیہ بیس پیسہ کمیشن مجھے حق محنت کے طور پر ملے گا مگر ابھی تک گلابو نے صرف دو سو روپئے دیئے ہیں۔ اسمٰعیل سنتے ہی بھڑک اُٹھے۔

اسمٰعیل: کوئی کمیشن نہیں۔ توتا اب کمپنی کا نوکر ہے۔ خاص بڑی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ نقد چڑھاوے کے لئے سیل بند بکسے کمپنی کی طرف سے رکھے جائیں گے۔

جمالو: لیکن حضور میری محنت۔

اسمٰعیل: کیسی محنت؟

جمالو: میں نے ہی تو توتے کو سکھایا ہے حضور۔

اسمٰعیل: تم کو معلوم ہے کمپنی اب تک پانچ لاکھ روپیہ صرف توتے بابا کی پبلسٹی پر خرچ کر چکی ہے۔ آئندہ سے تمہاری کارکردگی کو دیکھ کر تنخواہ دی جائے گی ورنہ کسی دوسرے ٹرینر کو رکھ لیا جائے گا۔ ہزار روپئے تم مجھ سے لے لو، اسمٰعیل نے نوٹ پکڑا کر بی جمالو کو کمرے سے رخصت کر دیا، شوہر کو اکیلا پا کر بیگم خٹک اداسی سے بولی۔

بیگم خٹک: اب تو تمہیں توتے کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں، نہ وقت پر کھاتے ہو نہ سوتے ہو، ڈائبٹیز اور بلڈ پریشر کا موذی مرض لے کر بیٹھ گئے ہو، بات بات پر غصہ کرتے ہو، میرے اوپر ہاتھ اُٹھانے لگے ہو۔

اسمٰعیل: گلابو شابو کو جگہ میں نے اپنے اصطبل میں دی۔ توتے اور اس کی مالکن کی آبادکاری میرے ہاتھوں ہوئی اور جب لوگوں نے دیکھا کہ توتا ایک ٹکسال میں بدل سکتا ہے تو وہ اس کو مجھ سے چھین لینے کے درپے ہو گئے۔ خزانہ مل جانا آسان ہے مگر خزانے کی حفاظت جان پر بن آتی ہے۔ توتے کو ان جوکھموں سے بچانے میں مجھ پر کیا گزری ہے اب تم کو کیسے بتاؤں۔ پچاس لاکھ روپے توتے بابا کی پبلسٹی کے لئے رکھے جائیں گے۔ میدان کے مغرب میں زائرین کے لئے بینک سے قرض لیکر سرائے

بنوانے کا پروگرام ہے یہ کہہ کر اسمٰعیل کمرے سے چلا گیا۔
شنابو نے مہرن کے پاس لیٹے لیٹے اس کی باپ کی یہ باتیں سن کر ٹھنڈی سانس لی۔مہرن بہ ظاہر سوتی پڑی تھی اس لئے صبح جب اس کا منگیتر اقتدار عالم اس سے ملنے آیا تو مہرن نے ساری باتیں اسے بتا دیں جسے سن کر اقتدار عالم کو ذرا بھی تعجب نہ ہوا، اس نے مہرن کو سمجھایا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسمٰعیل طاقت کا بھوکا ہے۔توتے کے ذریعے بڑھتی آمدنی پر قبضے کے لئے طاقت کے جس ڈھانچے کی تعمیر کے دوران لہولہان ہونا پڑتا ہے اسمٰعیل کے لئے اتنا لہولہان ہونا بھی ضروری تھا کہ اس کے مرکز میں وہ پوری طاقت سے خود کو موجود اور محفوظ رکھ سکے۔

اقتدار عالم ایم ایل اے تھا، سیاسی آدمی ہونے کے سبب آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔ اپنے ہونے والے سسر اسمٰعیل خٹک کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ طاقت کا دیوانہ ہے۔اقتدار کی شروع سے اس بات پر نظر تھی کہ اسمٰعیل توتے کو قابل فروخت بنانے کے لئے کتنا بڑا پاور اسٹرکچر دھیرے دھیرے کھڑا کر رہا ہے۔سیاست میں ہونے کے سبب اقتدار عالم کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکار قبائلیوں کی اصلاحی اور فلاحی اسکیموں کی پشت پناہی کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ایک دن اُس نے بی شنابو کو مہرن کے سامنے روتے ہوئے دیکھ لیا۔رونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی "میاں میری قسمت میں ہی رونا ہے۔ورنہ میرے پاس بھی ایک مینا ہے، پٹر پٹر بولتی ہے، ایک گلابو کا توتا ہے کیا قسمت لے کر آیا ہے"۔یہ سن کر مہرن کے منگیتر کے دل میں ایک بڑا اچھوتا خیال آیا، اس خیال کو اس نے آدی واسی منترالیہ کے کچھ دوستوں سے بیان کیا۔جب بعض لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی تو اس نے اپنا پلان مہرن سے بیان کیا۔مہرن بہت گھبرائی، بولی۔

"یہ نہ کرو۔میرا باپ سمجھے گا کہ تم اس کی مقابلہ آرائی پر اتر آئے ہو"۔

لیکن اقتدار عالم نہیں مانا بی جمالو کو بلوا بھیجا۔وہ آئی تو بڑی رازداری سے پوچھا۔

"جیسے تم نے گلابو کے توتے کو پڑھایا ہے۔کیا شنابو کی مینا کو بھی پڑھا سکتی ہو؟ بی

جمالو جلی بھُنی بیٹھی تھیں، ہتنک کر بولیں ”اے بیٹا توتے کو پڑھا کر اس بڑھیا کو کیا ملا جو مینا کو پڑھا کر ملے گا۔ کمائی تو دوسرے کھا رہے ہیں“۔

”تم اس کی فکر نہ کرو میں تمہیں پیشگی کچھ رقم دونگا اور ماہوار تنخواہ بھی لیکن ہم مینا کو تیار کرنے میں اب نئی ٹیکنالوجی کی مدد بھی لیں گے۔“ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، نئے استادوں کے ساتھ بی جمالو بھی مینا کو پڑھانے میں لگ گئیں۔

توتے کے بھگتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسمٰعیل اور اس کے ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ توتے کے ہاؤ بھاؤ میں کچھ نئے اضافے کرنے کے لئے ماہرین کی ایک خاص کمیٹی بنائی گئی جس کی سفارشات کی رو سے توتے کی شخصیت میں تھوڑی فقیری کی شان پیدا کرنا بازار کی ضرورتوں کے اعتبار سے کافی منفعت بخش بتایا گیا تھا۔ ایسے دو ماہرین تلاش کر لئے گئے جو توتوں میں روحانی خصوصیات اُبھارنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خبر آئی کہ توتا موسیقی کے بعض ٹکڑوں پر حال اور قال کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگا ہے۔

ایک خبر تو یہ بھی تھی کہ پرندوں میں Genetic Engineering کے تجربے کرنے والے ڈاکٹروں کے پاس توتے کو مہینے میں تین بار لے جایا جاتا ہے۔ اب توتا سوال کا جواب دینے سے پہلے آنکھیں بند کر کے اور گردن آسمان کی طرف اُٹھا کر دو پل دیکھتا ہے۔ پھر گردن نیچی کرتا ہے آنکھیں کھولتا ہے اور جواب دیتا ہے ”ملے گا۔ ملے گا“ اس کے بعد رکارڈ کی ہوئی آرکسٹرا کی دُھن بجتی ہے۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق اور اس دُھن پر توتا مجذوب کی طرح اپنے دونو بازو ہوا میں اُٹھا کر رقص کرتا ہے، اب وہ کافی بڑے اور خوبصورت پنجرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ دراصل بنیادی حقوق اور سماجی انصاف کے اداروں کی جن خواتین اراکین سے اقتدار عالم کی دوستی تھی ان کے ذریعے اقتدار کو مقامی آدی باسیوں کی بدحالی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس طبقے کے پچھڑے پن، جہالت، روایت پسندی، شراب نوشی، خاندانی تشدد وغیرہ جیسی بدعتوں کی اصلاح کے لئے

قدم اُٹھانے کی کارگر کوششوں کے لئے اقتدار کے دل میں اس جذبے سے زیادہ کمائی کا راستہ نکالنے کی فکر بھی تھی۔ اس طبقے کے عام لوگوں کے خواب اور محرومیوں کی تفصیلی چھان بین کے اعداد و شمار اقتدار عالم نے حاصل کرلئے تھے۔ مہرن اپنے منگیتر سے چاہتی تھی کہ وہ شابو کی پنجرے کی مینا کی مدد سے اس آدی باسی طبقے کی خرابیوں کی اصلاح کا کوئی راستہ نکالے۔ منگیتر اقتدار عالم سیاسی آدمی تھا ایسی سرکاری اسکیموں سے واقفیت اور ان تک پہنچ بھی رکھتا تھا۔ بعض متعلق لوگوں سے اس نے جب اپنا خیال بیان کیا تو انھیں خاصے امکانات نظر آنے لگے۔ بس پھر کیا تھا اقتدار عالم اپنے چند خاص ساتھیوں کے ساتھ اس پروجیکٹ میں جٹ گیا۔ شابو کی سیدھی سادھی پنجرے کی مینا اب مینا جوگن بن گئی۔ آدی واسی اپنی کونسی حاجتیں اور مرادیں لے کر آئیں گے اور کیا سوال کریں گے ماہرین نے اس کی کھوج کی اور بی جمالو نے مینا جوگن کو اس کے جوابات رٹانے کی مشق کرائی۔ مہرن یہ سب دیکھ رہی تھی، اقتدار عالم نے جب کچھ لوگوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی جس کا مشورہ تھا کہ اس کام میں تھوڑا بہت گلیمر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ بھولا بھالا آدی واسی دیکھ کر بھونچکا رہ جائے۔ مہرن نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسکیم کا مطلب پیسہ کمانا نہیں ہونا چاہئے لیکن کسی نے نہیں سنا۔ سوال کرنے سے پہلے مینا کو ایک گانے کی دُھن سنائی جاتی۔ اس گانے کی دُھن پر مینا کو جواب رٹائے گئے تھے۔

موسیقی کے ماہر نے سوالی کے سوال پر نظر کی اس کے مطابق گانے کا انتخاب کیا۔ گانا بجنا شروع ہوا۔

آوارہ ہوں۔ یا گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں۔ آوارہ ہوں۔

جیسے ہی گانا ختم ہوا، آنے والے سے سوال کرنے کو کہا گیا، سوالی نے سوال پوچھا۔

”مینا جوگن میری غریبی کب دور ہوگی“ مینا نے جواب دیا۔

”غریبی دور کرنا چاہتے ہو؟“

"ہاں میں چاہتا ہوں" آدمی گڑگڑایا۔ جواب ملا۔

"دارو چھوڑ دو۔ غریب نہیں رہو گے"

اگر کسی کو اس طرح کی بات پوچھنا ہوتی کہ وہ فلاں جگہ لڑکی کا رشتہ کرے یا نہ کرے تو مینا کو یہ گانا سنایا جاتا

"انکھیاں ملا کے۔ جیا بھرما کے چلے نہیں جانا۔ او ہو چلے نہیں جانا"۔ گانا سن کر مینا فوراً سوال کرتی۔

"قرض دار ہو؟"

"ہاں بیس ہزار کا" آدمی منہ لٹکا کر جواب دیتا۔

"اُدھاری ادا کرو، شادی بعد میں" مینا کی نصیحت سن کر آدمی واسی حیران رہ جاتا۔ دل پر اثر بھی کچھ زیادہ ہوتا۔ اگرچہ اس کام میں توتے والی آمدنی تو نہ تھی مگر پھر بھی شابو کے دروازے پر بھیڑ رہنے لگی۔ اچھے سوالوں پر انعام دیئے جانے لگے اور یہ دکھائی دینے لگا کہ پروجیکٹ شہرت حاصل کرلے گا۔

پھر جب اسمٰعیل خٹک کو معلوم ہوا کہ اس کا ہونے والا ایم ایل اے داماد مینا جوگن کے آشرم کی چپکے چپکے ترقی کے لئے لگا ہوا ہے تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ شام کو جب وہ اپنی منگیتر سے ملنے آیا تو اسمٰعیل سگار جلائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت اقتدار عالم اور اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور اندر کی جانب ایک نو تعمیر کمرے میں لے گیا اور بولا "تم دونوں اس بات کو سمجھ لو کہ ہمارا کاروبار کس قدر سائنسی بنیادوں پر چل رہا ہے، یہ کہہ کر اس نے دیواروں پر ٹنگے توتوں کے بدن کے رگ وپٹھے اور اعضاء کے نقشے جو بھاری تعداد میں ٹنگے ہوئے تھے دکھائے۔ پھر اس نے بتایا کہ تقریباً ۱۰۰ کے قریب ماہرین اس پروجیکٹ میں لگے ہیں، توتے بابا کو پانچ ہزار کا ایک انجکشن ہر ہفتے لگتا ہے۔ توتے کے اندر یادداشت ذہانت اور سمجھداری کو اپنی ضرورت کے مطابق قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ جو لوگ اس کام میں سرمایہ لگا رہے ہیں وہ زیادہ تر دوسرے کاروباروں میں ہارے ہوئے لوگ ہیں، یہ دیکھ کر

کہ تمہارا کوئی عمل ان کے پیٹ پر لات مار رہا ہے تم راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔
توتے بابا سے عقیدت کی حالت یہ ہے کہ توتے بابا پر قیمتی چڑھاوے چڑھ رہے ہیں، انھیں کہاں رکھا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ بیرونی ممالک سے آنے والے توتے بابا کے بھگتوں کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام ہم نہیں کر پار ہے ہیں۔ اگر تم یہ بزنس کرنا چاہو گے تو گھر کے آدمی ہو، ہم تم کو اجازت دے سکتے ہیں اور جو مدد چاہو وہ بھی، چار پیسے تم بھی کما لو گے۔
لیکن اس کا منگیتر اقتدار عالم کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، خفگی سے بولا۔
"دن بھر رسوئی گھر میں مرو، تب چالیس ہزار مہینہ کماؤ۔ ملائی کوئی اور کھائے تم تل چھٹ کھاؤ۔ مجھے نہیں چلانا ہے ڈھابا"۔
جب مینا جوگن کا باقاعدہ آشرم کا افتتاح ہوا تو پولیس بینڈ بجا، آتش بازی چھڑائی گئی۔ اخباروں میں پورے صفحے کے اشتہار چھپے، پریس کے نمائندوں کو ہوٹل میں دارو کے بعد ڈنر دیا گیا۔ پریس نوٹ میں پورے کام کو سیاسی اور اصلاحی رنگ دیا گیا تھا اور یہ مقصد بیان کیا گیا تھا کہ مینا جوگن کی مدد سے آدی واسیوں کے پچھڑے پن کی اصلاح کے لئے کچھ نئی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ادارے کا کچھ کمانے کا منشاء نہیں ہے بلکہ معقول آمدنی ہونے پر اسے آدی واسیوں کی اصلاح پر ہی خرچ کیا جائے گا، ادارے کا اعزازی پیٹرن آدی واسی منترالئے کی وزیر ریاست کو بنانے کی تجویز بھی سب سے اوپر تھی۔

توتے بابا کے کارکنوں کی صفوں میں اس افتتاح سے ہڑکمپ مچ گیا، اسمٰعیل خٹک کو فوراً ہنگامی میٹنگ بلانی پڑی۔ اس میٹنگ میں اقتدار عالم کے چھوڑے ہوئے جاسوس بھی موجود تھے انھوں نے آ کر خبر دی کہ ہر ممبر کو مینا جوگن کے فراڈ کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ بحث میں کہا گیا کہ یہ دعویٰ بالکل جھوٹا ہے کہ آدی واسیوں کی اصلاح کے لئے یہ گل کھلایا گیا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس پورے سیاسی کھیل کے پیچھے اسمٰعیل خٹک کے ہونے والے داماد اقتدار عالم کھلے خزانے موجود ہیں۔

ایک ممبر جن کا چہرہ رعب دار تھا، چوڑی چھاتی اور بھاری مونچھیں تھیں اور اسمٰعیل خٹک کی داہنی بھاری بھرکم کرسی پر بیٹھے تھے اور گلے میں ریوالور کی پٹی مع گولیوں کے پڑی تھی، دونوں آنکھیں بند کر کے جملہ بولتے تھے پھر آنکھیں کھولتے تھے، انھوں نے پہلے آنکھیں بند کیں اور پھر بولنا شروع کیا۔

اسمٰعیل اب تک یہ بات سمجھ گئے ہونگے کہ ہمارے کاروبار میں، ہمارے اپنے کی پہچان کیا ہے؟ اگر نہیں سمجھے ہیں تو ایک بار پھر سمجھ لیں" یہ کہہ کر انھوں نے بند آنکھیں کھولیں، ادھر اُدھر دیکھا پھر آنکھیں بند کیں اور بولے "ہمارا داماد یا ہمارا بیٹا یا بیٹی ہمارے اپنے نہیں ہیں، ہمارا تو وہ ہے جو اپنی پہچان الگ نہ رکھے بلکہ جس طرح ہم اسے پہچاننا چاہتے ہیں اس طرح وہ خود کو ہمیں پہچنوائے۔ ہمارا تو صرف وہی ہے جو ہمارے انگوٹھے کے نیچے رہے، جو ایسا نہیں کر سکتا ہے وہ ٹریگر پر رکھی ہوئی ہماری انگلی کے نیچے دب سکتا ہے"۔ پھر اس نے اطمینان سے آنکھیں کھولیں، اسمٰعیل کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے کہا۔

"اپنی بیٹی اور اس کے بوائے فرینڈ کو میرے پاس بھیج دو لیکن ایک ساتھ نہیں الگ الگ"۔ لگتا تھا تو تا بابا آشرم کا ڈائرکٹر وہی تھا۔

میٹنگ ختم ہوئی تو بستر پر آنے کے بعد اسمٰعیل کو نیند نہیں آئی۔ سویرے بیوی کو منہ دھونے سے پہلے سختی سے ہدایت کی کہ وہ بیٹی کو اپنے مائکے بھیج دے اور اقتدار عالم اس وقت تک یہاں نہیں آئے جب تک وہ اجازت نہ دے۔

اقتدار عالم اور مہرن کو بھاری مونچھوں والے سے ملنے کے لئے بلایا گیا، مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔

مہرن کو نانی کے گھر پہنچ کر سب سے بڑا غم اور غصہ اس بات پر تھا کہ اقتدار عالم اس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ اقتدار سے محبت کرتی تھی اور اسے کافی ہاؤس کی ملاقاتوں میں سب کچھ بتا چکی تھی کہ وہ کیا ہے۔ اس نے اقتدار کو فون کیا لیکن شکایت سے پہلے اقتدار نے یہ کہہ

کرمعذرت کرلی کہ مینا جوگن کے پروجیکٹ میں وہ بہت مصروف ہوگیا تھا۔اسے پنجرے کی مینا کو منڈی میں اتارنے کے لئے کارپوریٹ فکر میں ڈھلی ہوئی ایک خوبصورت پیشہ ورعورت کی ضرورت تھی جو اسے مل گئی ہے۔مہرن کو اپنے باپ پر جس نے مہرن کو گھر سے ہٹادیا تھا حیرت نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ماں کو اکثر باپ سے یہ کہہ کر لڑتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

''طوطا اتنا طاقتور ہوگیا کہ اس کے خوف کے علاوہ کسی کا خوف تمہارے دل میں نہیں رہ گیا۔پرانی داستانوں کی طرح تمہاری جان اب توتے کے اندر ہے''۔

کچھ دن خاموشی سے گزر جانے کے بعد کا یہ واقعہ ہے جس کی رپورٹ کہیں نہیں کی گئی۔

رات کے ایک بجے کا عمل رہا ہوگا۔

اقتدار عالم ٹیکسی سے اتر کر ایک نیم روشن گلی میں پیدل داخل ہوا۔دو لمحوں بعد یکا یک اس کے دائیں اور بائیں دو لمبے تڑنگے مرد اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگے۔اقتدار عالم اُن دونوں کے بیچ میں چل رہا تھا یکا یک اقتدار عالم کے داہنے کندھے کی طرف چلنے والا بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے سے بولا۔

''ہمارا وہ ہے جو اپنی شناخت نہ رکھے''

بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے نے فوراً جواب دیا۔

''ہمارا صرف وہ ہے جو صرف ہمارے انگوٹھے کے نیچے رہے''۔

پھر دائیں طرف کے کندھے والے نے بائیں طرف والے کو مخاطب کیا۔

''جو انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے ٹریگر پر رکھی انگلی دباتے ہیں''

اقتدار عالم بھونچکا کبھی داہنے اور کبھی بائیں دیکھتا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس سے مخاطب ہی نہ تھا وہ تو آپس میں باتیں کررہے تھے آخر وہ لمبے تڑنگے آدمی یکا یک واپس لوٹ گئے۔اقتدار عالم کو رات کے سناٹے میں یوں خوفزدہ اور ہراساں کرنے والی واردات کی رپورٹ کہیں نہیں لکھوائی گئی۔اس طرح کا سانحہ چند نوں میں ایک بار نہیں بلکہ

کئی بار دہرایا گیا۔آخری بار اس جملے پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا۔
''جو ہمارے انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے بس ٹریگر پر رکھی انگلی دبا دیا کرتے ہیں''

الیکشن اب بہت قریب تھا،اس میں بھی شک نہ تھا کہ اقتدار عالم کی پارٹی کنگ میکر کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ نئے حالات کو دیکھتے ہوئے برسر اقتدار پارٹی خود کے تحفظ کے لئے بڑی خاموشی سے نئے عہد و پیمان اور نئی وفاداریاں قائم کر رہی تھی مگر اخبارات کی اٹکلوں کے باوجود وہ گہرا راز بنتی جا رہی تھیں۔

مہرن پہروں سوچنے پر بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ کونسی طاقت تھی جس نے توتے جیسی Love Bird کو بوٹیاں نوچنے والے خونخوار گدھ میں تبدیل کر دیا ہے تو کیا شابو کے چھوٹے سے پنجرے والی صابر اور شاکر مینا کے ساتھ بھی یہی ہونے جا رہا ہے۔ پورا ایک پاور اسٹرکچر کھڑا ہوگا۔یعنی دغا فریب، منافقت، مارکاٹ جنگ و جدال پھر مہرن کو لگا جیسے اقتدار عالم کی خون میں لت پت لاش بیچ سڑک پر پڑی ہے۔اس نے خوفزدہ آواز میں اپنے منگیتر کو مینا آشرم سے سبکدوش ہو جانے کا مشورہ دیا تو اقتدار عالم چہک کر بولا۔

''خاموش بیٹھی رہو۔جلد ہی تم ایک اچھی خبر سنوگی''

''کیسی خبر؟''

''گھنی مونچھوں والے سے ہماری کولڈ وار کے سلسلے میں''۔

دوسری طرف منڈی میں پلی اور کارپوریٹ فکر میں ڈھلی اس گڑیا کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا اس کو تو اقتدار نے کرائے پر حاصل کیا تھا،اس نے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ جہاں داخل ہوتے ہی سب کی نظر پڑے شیشے کے آبنوسی فریم میں یہ عبارت لگا رکھی تھی۔

میں معاشی اور نظریاتی طور پر اس کی وفادار ہوں جو میری دانشوری کو کام میں لاتا ہے اور اس کی مجھے اجرت دیتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں اسمٰعیل کے پاس ناچتی گاتی یہ خبر پہنچ گئی کہ کسی نائٹ سروس بینک کے سنسان سے کاری ڈور میں ایک رات دو زنخوں نے جن کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی گھنی مونچھوں اور بھاری آواز والے بینک کے ایک گاہک کو گھیر لیا۔ وہ ریوالور والے کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر دائیں بائیں چلنے لگے اور اس کے کانوں میں اپنی باتیں اسے مخاطب کئے بغیر ڈالنے لگے۔ پہلا بولا۔

دیکھو میری جان سیاست میں ایک دشمن ہمیشہ پال کر رکھنا چاہئے'' دوسرا زنخا جواب میں۔

''اس لئے کہ دشمن آپ کو چوکنا رکھتا ہے''۔

''بالکل ٹھیک'' پہلے والا زنخا فوراً بولا''لیکن سیاست میں آج جو آپ کا دشمن ہے کل دوست بھی ہو سکتا ہے'' دوسرا زنخا ہنسا اور جواب دیا۔

''کیونکہ توتے کے خزانے سے اس نے جو غیر قانونی کمپنیوں کا جال بچھا رکھا ہے اور جو سرکاری لائسنسوں کے بغیر مالی اسکیمیں چل رہی ہیں ان کا کیا ہوگا''۔ دوسرے نے فوراً بات ماری۔

''پھر تو انفورسمنٹ ڈائرکٹریٹ دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے گا یا پھر بدنامی کے ڈر سے تم اپنے ہی ریوالور سے اپنے سر میں گولی مار لو گے۔'' ابھی تک دونوں زنخے آپس میں ہی باتیں کر رہے تھے اور ریوالور والے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے لیکن اب زنخے نمبر ایک نے اشارے سے گھنی مونچھوں اور ریوالور والے کو روکا، اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر فحش انداز کی بازارو لٹک مٹک کے ساتھ بولا۔

''اب جانی آخری بات۔ جلدی فیصلہ کرو کہ تم کو مینا جوگن سے لڑنا ہے یا صلح کرنا ہے؟'' گھنی مونچھوں والا غصے سے ابل رہا تھا اس نے زنخے کی کلائی پکڑ لی۔ زنخا چلایا۔

''اوئی میں مری۔ مردوا میری عزت لوٹ رہا ہے''۔ لوگ اِدھر مخاطب ہوں اس سے پہلے کلائی چھوڑ دی گئی تھی اور دونوں زنخے منظر سے باہر ہو چکے تھے۔

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ راہ چلتے سڑک پر دو زنخے گھنی مونچھوں والے کو اتنا سب کچھ کہہ جائیں اور اس کے جوائنٹ ڈائرکٹر یعنی داہنے ہاتھ اسمٰعیل کو خبر نہ کی جائے جبکہ اس رواں دواں دولت اور طاقت کا سرچشمہ اسمٰعیل خٹک ہی تو تھے۔

یہ میٹنگ اسمٰعیل خٹک کے خاص پرائیویٹ کمرے میں پوری راز داری کے ساتھ کسی کے علم میں لائے بغیر ہوئی۔ اسمٰعیل خٹک اس ایک واقعے کی تفصیل پر گہری نظر رکھ کر اپنے بھاری مونچھوں والے ساتھی کو یاد دلا رہا تھا۔

"یہ اس حادثے کا جواب ہے جس میں دو زور پشت آدمی اقتدار عالم کو دائیں بائیں گھیر کر اسے خوفزدہ کر دینے والی باتیں سنا کر گئے تھے"۔ بھاری مونچھوں والے نے اقرار میں گردن ہلائی، "وہ تو ہم نے ہی بھیجے تھے" اسمٰعیل تیوریوں پر بل ڈال کر غصے سے بولا "مجھے افسوس ہے کہ اس سانحے کے پیچھے میرے ہونے والے داماد کا ہاتھ ہے"۔ بھاری مونچھوں والا یہ سن کر دبی مسکراہٹ مسکرایا اور بولا۔

"صرف ہونے والا داماد ہی نہیں، اگر تمہاری بیوی بھی اس میں شامل ہوتی تو بھی یہ تعجب کی بات نہ ہوتی۔ میں تمہارے پاس یہ شکایت لے کر ہرگز نہیں آیا ہوں۔ ہم جو کام کر رہے ہیں، یعنی دولت اور طاقت کا جو کھیل کھیل رہے ہیں اس میں رشتوں کی حقیقت تاش کے پتوں کے محل سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ بات میں بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں اور تم بھی" اسمٰعیل نے بھاری مونچھوں والے کی بات کی تائید کی تو بھاری مونچھوں والے نے آنکھیں بند کیں اور بڑی کمزور آواز میں بڑبڑایا۔

"سیدھی بات یہ ہے کہ یہ سانحہ اور سڑک پر گستاخانہ طور پر زنخوں اور زنانوں کے ہاتھوں ہمیں دہشت زدہ کرنے کا یہ عمل صاف بتا رہا ہے کہ Power Shift ہوئی ہے۔

کچھ دنوں سے مہرن کو لگ رہا تھا کہ گھریلو تلخیوں سے پیدا ہونے والے اس کی ماں کے آنکھ کے کچھ آنسو خود مہرن کی آنکھوں میں بھی تیرنے لگے ہیں۔ وہ بار بار سوچتی آخر وہ کیا چیز ہے جو اس کے منگیتر سے اسے خاموشی کے ساتھ خوفزدہ کرنے لگی

ہے۔

مہرن کو لگا کہ اقتدار کے نزدیک خوبصورتی اور علم کے معنی وہ نہیں جو مہرن کی نظروں میں ہیں۔ وہ اس علم کو علم نہیں مانتی تھی جس سے بصیرت حاصل نہ ہو۔ یہ اس روز کی بات ہے جب وہ کافی ہاؤس میں اقتدار کے ساتھ بیٹھی تھی اور ساتھ میں کارپوریٹ فکر میں ڈھلی وہ جاپانی گڑیا بھی تھی۔ جو فوراً بول پڑی تھی۔ ''یہ بصیرت کیا چیز ہوتی ہے۔ ہماری دانشوری بت شکنی کے چکر میں نہیں پڑتی۔ ہماری دانشوری تو اُدھر جھکتی ہے جدھر طاقت اور اتھاریٹی ہوتی ہے۔ جب تک اقتدار صاحب کے پاس طاقت اور اختیار ہے ہم ان سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ مہرن غصے میں اٹھ کر چلی آئی، اقتدار نے اسے روکا بھی نہیں۔

اس دن مہرن نے جب باپ کی دراز کھولی تو ریوالور کی کچھ گولیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو غصے سے تمتماتے ہوئے گالوں کے ساتھ سوچتی رہی کہ ان میں سے کس گولی پر اس بازارو گڑیا کے پیچھے اقتدار عالم کا نام لکھا ہوا ہے۔

انھیں دنوں مہرن کو معلوم ہوا کہ توتا آشرم کا طاقتور بھاری مونچھوں والا اقتدار کو اپنی کمپنی کا اعزازی ممبر بنا کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے جا رہا ہے، مہرن نے فون پر اقتدار سے اس کی تصدیق چاہی تو اس نے جواب دیا۔

''ہمارا کام پیسہ کمانا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ضد بن کر نہیں رہ سکتے''۔

''پھر انھوں نے ہماری توہین کیوں کی؟ مہرن چیخی'' مجھے میرے گھر سے نکلوا دیا''

''تب انھیں ایسا لگا تھا کہ ہم ان سے کمتر ہیں۔ اب انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے بھی توتے ہیں، اچھا پھر بات کرونگا ابھی جلدی میں ہوں'' فون کاٹ دیا گیا اور مہرن اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

اقتدار عالم اب بہت کم مہرن سے مل پاتا تھا۔ ایک معمولی مینا کے وسیلے سے عام لوگوں میں اس کی شہرت آدی واسیوں کے مسیحا کی بنتی جا رہی تھی اور وہ اپنی پارٹی میں روز

بروز باعزت سے باعزت مقامات حاصل کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مینا کی مالکن شتابو کو اس جاپانی گڑیا کے ساتھ کبھی کبھی اونچے سیاسی گلیاروں میں گھومتا ہوا پایا جارہا تھا۔ شتابو نے مینا کو پوری ایک جوگن کا روپ دے دیا تھا، اسے مقامی آدی واسیوں کی زبان سکھانے میں بڑی محنت سے اپنے وسائل استعمال کئے تھے۔ جاپانی گڑیا نے مینا جوگن کی بھیلوں کی بستی میں اخبار والوں کو ساتھ لے جا کر کچھ شو کئے تھے اور اقتدار عالم کے ساتھ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ مہرن کے شب و روز میں اس کے منگیتر کا رول تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ مینا جوگن کی انتظامیہ کمیٹی میں اس کے باپ کے حلیف گھنی مونچھوں والے کو اس کے منگیتر کے ذریعے شامل کئے جانے کی خبر خاصی گرم تھی۔ مہرن نے بہت کوشش کی کہ فون پر اقتدار عالم سے رابطہ قائم ہو جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

وہ غصے کی حالت میں اقتدار کے دفتر پہنچ گئی جہاں دوسرے دن مینا جوگن دھام کی انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی، اس نے دیکھا ڈائس کے سامنے مینا جوگن دھام کے سینئر ممبر بیٹھے ہیں اور جاپانی گڑیا کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جسے دکھا کر وہ کہہ رہی ہے "یہ ہوشیار سنگھ بھگت کی انگریزی ناول ہے، تین مہینے میں اس سڑی ناول کی ۵ لاکھ کاپیوں کو پبلسٹی اور مارکٹنگ کے دم پر بکوا دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ پھر اس جاپانی گڑیا نے ایک سیانی لڑکی کو اپنے پاس بلا کر کھڑا کیا وہ شتابو کی لڑکی تھی، میز پر سے لکڑی کا پوائنٹر (Pointer) اٹھایا اور اس کی نوک لڑکی کے ایک پستان پر رکھ کر بولی۔

"یہ جیسے آپ کو نظر آرہے ہیں ویسے ہیں نہیں۔ بلکہ جیسے بازار چاہتا ہے ویسے ہیں۔ اس طرح اس لڑکی کی آنکھوں کی پتلیوں کے رنگ موسم اور محفلوں کے مزاج کے مطابق لینس کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں۔ (ہونٹوں پر پوائنٹر رکھ کر) نو طریقوں سے ہم نے اسے مسکرانا سکھایا ہے۔ مارکٹنگ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جب چاروں طرف سے آپ گھیرے میں لے لئے جائیں اور پھر وہ اتنا تنگ ہو جائے کہ آپ کو لگے کہ آپ کی بوٹیاں نچ رہی ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں" شتابو کی لڑکی کی معصومیت یوں چھنتے دیکھ کر

مہرن سے برداشت نہ ہوا۔ وہ غصے سے پیر پٹک کر وہاں سے چلی آئی۔ باہر آئی تو اس نے دیکھا مینا کی کچھ تصویروں کے قد آدم Blow ups دفتر کی باہری دیوار پر لگائے جارہے تھے۔ مینا واقعی بڑی پُرکشش جوگن نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا ''محبت کرنے والی چڑیا''۔

مہرن نے اس کے نیچے غصے میں لکھا ''اور تم؟'' پھر ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا کر چلی گئی۔

ساری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی، اس کا باپ تو پہلے ہی اس سے چھن چکا تھا، اب اس کا منگیتر بھی اس کا نہ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کو اپنے شوہر کے انتظار میں رات رات بھر روتے دیکھ چکی تھی، اسے لگا کہ وہ جس بازار میں بک سکتی تھی وہ بازار اجڑ چکی ہے۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی کو اقتدار عالم کا شکار نہیں بننے دے گی۔ دوسرے دن وہ اقتدار عالم کی میٹنگ میں جہاں بھاری موچھوں والے کو ممبر بنایا جانے والا تھا، خاص تیاری کے ساتھ گئی، اس نے دیکھا اقتدار کا چہرہ شراب کے اثر سے تمتما رہا تھا۔ مہرن نے اپنے دونوں ہاتھ اقتدار کے کندھوں پر رکھے اور اس کے کان میں دھیرے سے بولی۔

''ہم کوئی کام ایسا نہیں کر رہے جو کتابوں میں لکھا جائے گا، یہ اخباروں میں رہ جانے والے کام ہیں۔ پھر اس نے اپنے لباس کے اندر چھپے ریوالور کے لوہے کو محسوس کر کے دیکھا اور اطمینان سے ریوالور نکال لیا لیکن جب اس کی نال اقتدار کی گردن کی طرف گھمائی تو کیا دیکھتی ہے کہ اقتدار کی برابر والی کرسی پر ایک دوسرا اقتدار بیٹھا ہے، پھر دیکھتی ہے کہ تیسری اور چوتھی کرسی پر بھی اقتدار ہے، وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی جب اس نے دیکھا کہ ہال کی ہر کرسی پر اقتدار عالم بیٹھا تھا۔ مہرن کو یقین نہیں آیا۔ دیوانوں کی طرح ایک ایک چہرے کے قریب آنکھیں لے جاتی، غور سے دیکھتی مگر وہ اسے اقتدار عالم ہی نظر آتا۔ اتنے ڈھیر سارے اقتدار عالموں کو ایک جگہ دیکھ کر وہ کانپ گئی۔ وہ کس پر گولی چلاتی۔ کچھ دیر تک وہ اس اقتدار عالم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی جس کو وہ گولی مارنا

چاہتی تھی مگر اس ناکامی پر آخر کو پورے بدن سے کانپنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی باپ کی شفقت نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اور تو کچھ کیا ہوتا البتہ دوسرے دن ہاتھ میں ریوالور لئے اسمٰعیل کی بانہوں میں ایک بیہوش لڑکی کی تصویر اخباروں کے پہلے صفحے پر ضرور چھپی تھی۔

●●

باب دوم

مچھلی رے مچھلی

وہ کچھ پھینکتے تھے۔

ناقابل یقین رفتار سے وہ پھینکی ہوئی شے اپنے نشانے پر پہنچتی تھی۔

کسی خونخوار عقاب جیسی جھپٹ کو شکار ہونے والا محسوس کرتا۔

وہ ایک پل میں تڑپ اُٹھتا تھا۔

سب ہی جانتے تھے کہ اس سفاک یقین کو جو اس میں لتھڑا ہوتا تھا اس کا ناکارگر ہونا غیر ممکن تھا۔

یہ بات بھی آزمائی ہوئی تھی کہ وہ اسکوٹر اور موٹر سائیکل کے شور کے ساتھ غبار کی طرح اُٹھتے، نمودار ہوتے پھر اسی غبار میں بلبلے کی طرح غائب ہو کر لاپتا ہو جاتے۔

یہ بات لمبے تجربے کے بعد عام طور پر تسلیم کی جا چکی تھی کہ وہ سب ایک جیسے کپڑے پہنتے، ایک طرح کی مضحکہ خیز زبان بولتے اور ایک طرح سے سوچتے تھے بلکہ بعض Laboratries لیباریٹریز سے ملی رپورٹوں کے مطابق اُن سب کا پیخانہ بھی ایک جیسا ہوا کرتا تھا۔

سب جانتے تھے کہ وہ بستی کے باہر کے نہیں تھے۔ وہ شہر چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس باہر جانے کا کوئی بہانہ ہی نہ تھا۔

مقامی پولیس ہی نہیں بلکہ شہر کے دانشوروں تک کو معلوم تھا کہ بیکاری کے باوجود ان کے پاس موٹر سائیکلیں کہاں سے آتی ہیں اور وہ پھٹی ہوئی جینس خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے لاتے ہیں۔

ان کے کپڑوں سے ایک ہی طرح کی بو آتی تھی۔
وہ بو شہر والوں کے لیے اجنبی نہیں تھی۔
بلکہ اب تو وہ بو لوگوں کی ناکوں میں کوئی احساس، کوئی حرکت اور ارتعاش پیدا نہیں کرتی تھی۔
مگر بستی کی پولیس؟
پولیس اب اس بو کو خوب پہچانتی تھی۔
اگر پولیس یہہ کہہ دیا کرتی کہ جس بو پر آپ کو شک ہے یہ وہ بو ہے ہی نہیں یہ تو چمیلی کی بو ہے۔ تو آپ کا دعویٰ کمزور ہو جایا کرتا تھا۔

....

انتظامیہ نے بہت کوشش کی کہ بو کی طرح اُڑنے والے ان موٹر سائیکل سواروں کی شناخت ہو سکے لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ کب؟ کس وقت؟ وہ کدھر سے نمودار ہو کر کدھر غائب ہو جائیں گے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ تھانوں میں ان حملہ آوروں کی کوئی تصویر آویزاں نہیں تھی۔ بعض جگہوں پر جو سی۔ ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے ان سے بھی کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ لیکن کچھ دنوں میں ایک خبر ملی کہ حملہ آوروں میں سے ایک دو کی تصویر حاصل ہو جانے کی امید ہوگئی ہے۔ اس چھوٹی سی خبر نے پورے شہر میں تہلکہ مچا دیا۔ میڈیا کا بہت بڑا حلقہ ان تصویروں کے لیے دوڑ پڑا۔ مگر ہمیشہ کی طرح وہ تصویریں باہر نہ آسکیں، تصویریں اگرچہ زیادہ دھندلی نہ تھیں لیکن چہرے کو لیکر فوراً کوئی فیصلہ کیا جانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کل دو ہی تصویریں تھیں۔ دونوں میں یوں تو سب کچھ صاف تھا لیکن تصویر کے چہرے کو لیکر اختلافات تھے۔ بعض لوگوں کی یہ دلیل تھی کہ چہرہ بالکل صاف جنگلی سور کا ہے۔ دوسرے کچھ لوگ اس چہرے کو ان جنگلی کتوں کا بتا رہے تھے جو اپنے شکار کو نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دوسری تصویر کو دیکھنے کے بعد تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی بہت سی کاپیاں کرا کے سرکاری محکموں یہاں تک کہ یونیورسٹیوں تک

میں بھیجا گیا تھا۔ وائلڈ لائف کے ماہرین نے جب اس تصویر کو دیکھا تو انھوں نے تصویر کے چہرے کو فوراً پہچان لیا اور فوراً تصویر کے نیچے اپنی رپورٹ ان لفظوں میں لکھ کر بھیج دی۔

چہرے کے تھوتھن کو غور سے دیکھئے۔ آنکھوں کی زہریلی نگاہ پر نظر کیجئے یہ صاف ''اناکونڈا'' کا منہ ہے۔ یہ لمبا اور زہریلا سانپ اگر مرغابی کو پکڑ لیتا ہے تو اس کو اس کے بھاری پروں کے ساتھ ہی نگل جاتا ہے۔ وائلڈ لائف کے ماہرین کی رپورٹ پڑھ کر انتظامیہ بڑے تذبذب میں پڑ گئی تھی انھیں اس بات پر تو شک نہیں تھا کہ تصویر کا چہرہ اناکونڈا جیسا ہے لیکن ایک بات ان کے حلق سے بالکل نہیں اتر رہی تھی اور وہ یہ کہ اناکونڈا آدھی آستین کی دھاری دار ٹی شرٹ کب سے پہننے لگا ہے۔

اناکونڈا

تیندوے

بھیڑیئے

جنگلی کتے۔ پھر تو جیسے تصویروں کا انبار لگ گیا۔

کئی تصویریں جنگلی کتوں کی ملیں سب کے سب گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی جینس پہنے تھے۔

....

اسی درمیان بھری پری گنجان بازار کی عمارتوں کے پیچھے جدھر تھوڑا سا اکیلا بن تھا ایک واردات ہوگئی۔

ایک بوڑھے آدمی نے جو ادھر پیشاب کرنے آیا تھا بتایا کہ اس نے ہلکی ہلکی روشنی میں ایسے کتوں کو دیکھا ہے جو ایک جسم پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، وہ زندہ تھا یا مرا ہوا، وہ نہیں جانتا تھا، وہ جنگلی کتوں کے غول کی طرح اس کو چیرنے پھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب تفتیش کرنے والوں نے کھائے ہوئے شکار کے پاس کی گیلی مٹی پر برانڈڈ واکر جوتوں کے تلوں کے صاف نشانات دیکھے تو یہ مانتے ہوئے کہ جنگلی کتے قیمتی واکر شوز نہیں پہنتے ان کی فوٹو کھینچ لی۔

پھر یہ بات آسانی کے ساتھ طے ہوگئی کہ وہ چاہے بھیڑیے ہوں یا کتے فیشن میں چل رہے برانڈڈ جوتے پہن کر تیزاب پھینکتے تھے۔ کچھ شہادتوں نے اس شک پر سے بھی پردہ ہٹا دیا کہ شیشے کے بڑے منہ والے برتن تیزاب پھینکنے کے لیے استعمال ہوئے تھے۔

یہ سب جانتے تھے کہ کچھ ہونے والا نہیں۔

کیونکہ پہلے بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔

سب جانتے تھے کہ انتظامیہ کے پاس کوئی خبر آئے گی اور لوگ تھانے جا کر واویلا کریں گے تو تھوڑی دیر کو بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی اور بس۔ ایسا نہیں تھا کہ واردات ہونے پر سر جوڑ کر بیٹھا اور سوچا نہ جاتا تھا۔ لیکن سوچنا کیونکہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی اس لیے مٹھی بھر سوچنے والے سوچ سوچ کر اکتا جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ سوچنے والے اس نتیجے پر پہنچ ہی گئے کہ زیادہ تر وارداتوں میں موٹر سائیکل کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ موٹر سائیکل پر سوار حملہ آور اپنا کام کر کے موٹر سائیکل کی وجہ سے ہی پھرتی سے جائے واردات سے غائب بھی ہو جاتے ہیں۔

طے پایا کہ گھروں میں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہے باہر نکلنا چاہیے۔ سب کو ایک ساتھ نکلنا چاہیے، ہاتھ میں ہاتھ دے کر۔

معاملہ گمبھیر تھا۔ لوگ نکلے، موٹر سائیکل بیچنے والوں کے شوروموں پر گئے انھیں مجبور کیا کہ وہ موٹر سائیکل بیچنا بند کر دیں، جن لوگوں نے اس کو وقار کا مسئلہ بنالیا تو بعض جگہوں پر مشتعل بھیڑ نے ان کے شوروم ہی پھونک دیے۔ اور بھی راستے اپنائے گئے، ٹی شرٹوں اور گھٹنوں پر سے پھٹی جینس کو چوراہوں پر جلایا گیا۔

اس کے باوجود سب ہی محسوس کر رہے تھے تیزاب سے لڑکیوں کے جلائے جانے والے چہرے پہلے ہی کی طرح جلائے جا رہے تھے اور موٹر سائیکلوں کا استعمال اس بہیمانہ کام کے لیے جاری تھا۔ یہی نہیں اسکولوں کی عمارتیں، چائے خانے اور بازاروں کی بھیڑ بھاڑ تک وحشت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

لوگ سرکار کے پاس گئے۔ تجویز رکھی کہ ایک بیل کی چھوٹی بیل گاڑی موٹر سائیکل کی جگہ چلائی جائے لیکن سرکار نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ اتنے بیل مہیا کرنا ممکن نہیں پھر سائیکل کی پارکنگ کی جگہ نہیں بیل گاڑی کہاں پارک ہوگی۔

....

پولیس انسپکٹر راجیش کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی، ان کی جوان بیٹی موہنی کالج میں پڑھنے جاتی تھی۔ اس کو باپ پھٹی جینس بھی نہیں پہننے دیتا تھا۔ موہنی دل ہی دل میں ایسی تمام باتوں پر کڑھتی تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روکتی تھیں۔

اس پر پابندیاں تھیں۔

شام ہونے پر کسی کے گھر نہ جائے۔

اسکول کے لڑکے گھر پر ملنے نہ آئیں۔

اسمارٹ موبائل فون خرید کر دینے کی ضد بالکل نہ کرے۔

باپ موہنی کی ماں سے کہتا رہتا تھا کہ ہر وقت لڑکی کے ہاتھ میں فون نہیں رہنا چاہئے۔ سب سے الگ جا کر فون پر بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دن موہنی کا باپ غصے میں گھر کے اندر آیا، موہنی کی ماں کو بلایا اور اسے تاکید کی کہ موہنی کا کالج جانا بند کر دے۔ اس کے پاس بس ایک چہرہ ہی تو ہے وہ بھی جھلس گیا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ یا پھر لڑکی کو ساری زندگی گھر پر بٹھا کر کھلانے کے لیے تیار رہو۔

....

انھیں دنوں ایک سی سی ٹی وی کیمرے میں تیزاب پھینکے جانے کی ایک تصویر پکڑو میں آگئی۔لڑکی خوبصورت تھی لیکن اس کا چہرہ اب جل چکا تھا۔اس نے بتایا۔

ماڈلنگ اس کا پیشہ ہے۔

ساڑھے تین ہزار روپیہ خود کو دبلا پتلا رکھنے کے لیے۔دو ہزار چہرے کو ملائم اور چمکدار رکھنے کے لیے خرچ کرتی ہے۔

پلکیں نوکیلی رکھنا، آنکھیں کٹیلی اور بھویں سجل رکھنا بھی خاصہ خرچیلا سودا ہے۔پھر ساتھ میں ایک ماں بھی ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شوہر مرجائے تو عورت دو دن میں بوڑھی ہوجاتی ہے۔

اب کیا کروگی؟۔سوال کیا گیا۔تھوڑی دیر چپ رہ کر تیزاب سے جلی ہوئی لڑکی نے پوچھا۔

''کیا جواب دینا ضروری ہے؟''

''نہیں ضروری تو نہیں''۔پوچھنے والے نے خود کو خاموش کرلیا مگر لڑکی تکئے میں منہ چھپا کر بولی۔

''اگر میں یہ کہوں کہ اور کچھ نہ سہی کم سے کم چہرہ چھپا کر اپنا جسم سستے داموں بیچ تو سکتی ہوں تو آپ اس کو اخبار کی ہیڈ لائن بنا دیں گے نا؟''

پھر ایک دوپہر جب باپ تھانے پر تھا، ماں گٹھیا کے درد کو جھیل کر سو رہی تھی، موہنی نے اپنی سہیلی کو فون کیا۔

اگر زندگی بنانا ہے تو گھر سے نکلنا ہی پڑے گا۔

باہر ہزار طرح کے تیزابوں کا سامنا ہے۔

یہ تیزاب ایک پل میں جھلسا دیتے ہیں۔

ماں مجبور ہو کر کہتی ہے۔روٹی بنانا ہے تو ہاتھ تو جلیں گے ہی۔

لیکن باپ نے اسے گھر میں بند کر رکھا ہے۔ انتظار ہے کہ کیسا بھی رشتہ آئے اس کے ساتھ ڈھکیل دیا جائے۔

وہ فون پر روئی تھی، سسکیاں لی تھیں اس نے اس کے آنسو گالوں سے بہہ کر ہونٹوں تک آگئے تھے، سہیلی کے سمجھانے پر وہ ہچکیاں لینے لگی تھی، انھیں ہچکیوں میں اس نے اپنی سہیلی کو اطلاع دی تھی۔

''میرے کمرے کی چھت میں ایک پنکھا تو لگا ہے''۔

....

خوبصورت ماڈل پر تیزاب پھینکے جانے کی گتھی نہیں سلجھ رہی تھی واردات کا ویڈیو بار بار دیکھا جا رہا تھا۔ یہ صاف نہیں ہو پا رہا تھا کہ پھینکنے والے نے لڑکی کے چہرے پر تیزاب کیسے اُچھالا تھا جبکہ موٹر سائیکل چلانے والے کے دونوں ہاتھ موٹر سائیکل کا ہینڈل پکڑے ہوئے تھے۔ وہ جب لڑکی کے برابر سے نکل کر مشکل سے دو قدم ہی آگے گیا ہوگا کہ لڑکی چیخ اُٹھی تھی۔ حملہ آور اکیلا تھا اس کی پچھلی سیٹ خالی تھی۔ سوال یہ تھا کہ پھر عقاب کی طرح جھپٹتا ہوا تیزاب لڑکی کے چہرے تک کیسے پہنچا۔

....

انھیں دنوں اخباروں میں وہ دردناک اعدادِ شمار چھاپے گئے جن سے پتا چلا کہ پچھلے ایک سال میں شہر کی دو سو بیالیس لڑکیاں چھت کے پنکھے میں لٹک کر جان دے چکی ہیں۔ خبر ایسی تھی کہ بے چینی تو ہونا ہی تھی۔ پھر اس بے چینی نے ایک خاصے بڑے احتجاج میں تبدیل ہو جانے میں دیر نہیں کی۔ بجلی کے سامان کی دکانوں سے چھت کے پنکھے نکال کر سڑکوں پر ڈالے جانے لگے، ان پر بلڈوزر چلائے جانے لگے۔ کمروں میں کولر لگائے جانے لگے۔ موہنی نے سنا کہ اس کے باپ نے پنکھے اُتروانے کے لیے میکینک کو بلوایا ہے تو پھر موہنی نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ دوسرے دن اخبار میں پنکھے سے لٹک کر موہنی کے مرنے کی خبر عام ہو چکی تھی۔

....

خوبصورت ماڈل پر پھینکے جانے والے تیزاب کی واردات کی دوسری گھتی اور بھی پریشان کن تھی۔ حکومت کے سامنے سوال یہ تھا کہ کھلے بازار میں تیزاب کی فراہمی کافی دنوں سے بند کی جا چکی تھی۔ ابھی تیزاب کی دو تین دکانیں ہی جلائی گئی تھیں کہ انتظامیہ حرکت میں آ گئی تھی۔ ایسے راستے نکال لیے گئے تھے کہ تیزاب عام حالات میں حاصل ہی نہ ہو، خریدار کی تصویر، گھر کا پتا اور دوسری تفصیلات درج کی جاتیں، اتنی سختی ہونے لگی کہ تیزاب کوکین سے بھی زیادہ مہنگا ہو گیا اور ذرا سا شک ہو جانے پر پولیس کے چھاپے پڑنے لگے۔

یہ دیکھ کر کئی بار شہر کی انتظامیہ نے اپنی پیٹھ ٹھونکی تھی۔ تیزاب کے مورچے کی طرف سے بالکل سناٹا سا ہو گیا تھا۔ کئی الیکشن آئے اور گزر گئے کہیں تیزاب نہیں پھینکا گیا۔ کتنے بہت سے میلے ٹھیلے اور رام لیلائیں گزر گئیں اور راون جل گئے مگر کہیں سے تیزاب پھینکنے کی کوئی خبر نہیں آئی۔

اخبارات کا خیال تھا کہ یہ حکومت کے کڑے اقدامات کا نتیجہ تھا۔ سخت سزا کا خوف تھا اور دلوں میں بیٹھے اس خوف نے ہی لوگوں کو اس بہیمانہ حرکت سے باز رکھا۔ لوگ اب بھی سڑکوں کے کنارے لگے پرانے ہورڈنگس Hordings کو دیکھتے تو ہورڈنگس پر لکھی وہ خوبصورت عبارت ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی، وہ ٹھہر کر اسے پڑھتے۔

”تیزاب سے نہیں پیار سے جلایئے“۔ ان ہورڈنگس کا اثر یوں تو اچھا ہی پڑا تھا، یہ الگ بات ہے کہ بعض مضافاتی علاقوں میں دو چوٹیاں باندھ کر سائیکل پر کالج جانے والی لڑکیوں کو بعض منچلے لڑکوں نے روک کر پوچھ لیا تھا۔

”کیا آپ تیزاب کے بجائے پیار سے چلنا پسند کریں گی؟“

جواب میں لڑکی لڑکے کے ہاتھ پر کاٹ کر بھاگ گئی تھی۔

....

یوں تو تیزاب پھینکنے کی وارداتیں تقریباً نہیں کے برابر ہو چکی تھیں لیکن ویڈیو میں پکڑی گئی ایک واردات نے پورے انتظامیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، وہ ایک پب کی تصویر تھی۔

وہاں ناچنے کا بھی انتظام تھا۔

تیزاب سے جلنے کی اس واردات کے وی ڈی او کو دیکھ عقل حیران تھی۔ اس وی ڈی او میں دیر رات گئے مدہوش مالداروں کی تصویریں تھیں، جن کی خوبصورت اسپورٹس گاڑیاں بال روم کے فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی تھیں۔

ویڈیو دیکھنے والوں نے دیکھا۔

ہلکا ہلکا اندھیرا ہے، ایک تندرست جوڑا ایک دوسرے کو باہنوں میں لیے آہستہ قدموں سے رقص کر رہا ہے۔ لڑکی بے خود ہے۔ اپنے ہم رقص کے کندھوں پر گردن ڈال رہی ہے۔ لڑکا بے خود نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہیں۔

وہ شاطرانہ کنکھیوں سے لڑکی کے وجود کو ٹٹولتا رہتا ہے۔ بڑی مہارت سے اپنی ہم رقص کے اندر جھانکتا رہتا ہے۔

موسیقی کی لہریں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ فضا بوجھل اور خوابناک ہوتی جارہی ہے۔ روشنیاں مدھم اور سہمی ہوئی سی ہیں۔

مگر مرد پر اس عاشقانہ ماحول کا کوئی اثر نہیں ہے، اس کے رقص میں کوئی والہانہ رنگ ہے، نہ حرارت۔ وہ ناچ کو ایک کام کی طرح کر رہا ہے۔ یکا یک ویڈیو میں کچھ نیا ہوتا ہے۔ ہم رقص مرد کے ہونٹ ہلتے ہیں، بڑے مدھم لہجے میں وہ کہتا ہے۔

”ہم نے شادی نہیں کی نا؟“

”ہاں“۔ لڑکی جواب دیتی ہے۔

”پھر بھی شادی کیسے ہوئے لوگوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں“۔

''ہاں''۔ وہ پھر پھسپھسائی۔

اس کے بعد خاموشی ہوگئی۔ شاید وہ زہر میں بجھی ہوئی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں مرد کے چہرے پر کیمرہ مرکوز تھا۔ مرد کی کنپٹیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں، چہرے پر سختی پھیل گئی تھی۔ اس بار وہ جیسے غراتے ہوئے بولا۔

''اب لفنگا لباس پہن کر نکلنا بند کردو''۔

''تو کیا برقعہ اوڑھوں؟'' اس نے اپنے ہم رقص کے کان میں پھسپھسایا پھر اس کے جواب میں مرد کی جو آواز نکلی وہ شاید کوئی گہرا زخم کھائے ہوئے تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں اپنے تڑپتے دل کو کیسے روکتا ہوں جب تم دیر رات گھر میں داخل ہوتی ہو''۔

''تم بھی دیر میں آؤ'' لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا مگر وہ ایک پل سے بھی کم کی مسکراہٹ ایک بھیانک چیخ میں بدل گئی۔

ویڈیو میں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ تھامے، ہم رقص عورت درد سے چیخ رہی تھی۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ عورت کے پوائنٹ بلینک فاصلے سے اس کے چہرے پر تیزاب تھوکا گیا تھا۔

اخبار نے ایسا کہنے والوں کا خوب مذاق اُڑایا۔ پوچھا گیا۔

''کیا تیزاب تھوکا جاسکتا ہے؟''

''کیا تیزاب منہ میں بھر کر اس کی کلی کی جاسکتی ہے؟''

....

موہنی کے گھر کے سامنے چھوٹا سا کھلا میدان تھا۔ وہاں فراک پہنے ہوئے لڑکیاں زمین پر پالے بنا کر ان میں کودا پھاندا کرتی تھیں۔ یہ ایک طرح کا ناچ تھا اور کھیل میں لڑکیوں کا غول ایک لڑکی کو اپنے بیچ میں لیکر ناچتا تھا۔ جب ناچ تیز ہوجاتا تو غول میں سے ایک لڑکی بیچ میں ناچتی ہوئی لڑکی سی کہتی۔

مچھلی رے مچھلی۔

لڑکی جواب دیتی۔

بول میری مچھلی۔

تب لڑکی پوچھتی۔ مچھلی رے مچھلی۔ کتنا پانی؟ پھر پورا غول پوچھتا۔

کتنا پانی؟۔ کتنا پانی؟ تو بیچ میں کھڑی لڑکی بل کھاتے ہوئے بڑی ادا سے کبھی کندھے کے برابر ہاتھ رکھ کر تو کبھی ناک کے نیچے ہاتھ رکھ کر کہتی۔

مچھلی رے مچھلی۔ اتنا پانی۔ اتنا پانی۔

اگر پانی ناک سے اوپر ہوتا تھا پوچھنے والی لڑکی بھاگتی اور باقی لڑکیاں اسے پکڑ کر غول کے بیچ میں ناچنے والی کے سامنے لے آتیں۔

اس کھیل میں تھوڑے دنوں پہلے یہ لڑکیاں پانی کی سطح کو ناک کے نتھنوں سے کافی نیچے بتایا کرتی تھیں لیکن کچھ دنوں سے ان کے ننھے ننھے ہاتھ پانی کی سطح دکھانے کے لیے اوپر پھر اور اوپر اُٹھتے جا رہے تھے۔ وہ ناچتی تھیں بل کھاتی تھیں نازک ہتھیلیاں لہراتی تھیں پھر اشارہ کرتی تھیں۔

مچھلی رے مچھلی۔ اتنا پانی۔

اتنا پانی۔ ہاتھ کافی اوپر اُٹھنے لگے تھے پوچھنے والی لڑکیاں پکڑی جا رہی تھیں۔

....

اب تیزاب کا موضوع ناپسندیدہ موضوع بن چکا تھا۔ اس کے ذکر سے دل افسردہ ہو جایا کرتے تھے۔ ویڈیو کی چھان بین کے بعد یہ بات پکڑ میں آ گئی تھی کہ عورت کے ہم رقص مرد نے عورت کے چہرے کو تیزاب پھینک کر نہیں جلایا تھا۔

اب انتظامیہ کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا کہ تیزاب سے جلانے والے کونسے کپڑے پہنتے تھے یا ان کے کپڑوں سے ایک سی بو آتی تھی یا نہیں۔ پہلے ان کی شناخت کے واسطے ان کی تصویریں حاصل کرنے کے لیے انتظامیہ خاصی پریشان رہا

کرتی تھی۔اب تو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ وہ صرف موٹر سائیکل پر ہی نہیں چلتے تھے بلکہ ان کے پاس قیمتی اسپورٹس گاڑیاں بھی تھیں جس کا واردات کرتے وقت ایک دروازہ ہی نکال دیا جایا کرتا تھا تاکہ سڑک پر چلتے شکار کو گاڑی کے اندر آسانی سے کھینچا جاسکے۔بات تو بہت پہلے ہی صاف ہو چکی تھی کہ انٹرنیٹ پر آڑنے والا تیزاب اپنے پورے پیر پھیلا چکا ہے۔

....

موہنی کی ماں کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔موہنی اپنی سہیلیوں کو کھیل ہی کھیل میں خطرے کا نشان دکھا کر پنکھے میں لٹک کر مر چکی تھی۔اس کے بعد سے پورے محلے میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا،اس سناٹے کے دوران محلہ کے پرانے کنویں میں کچھ ہو گیا تھا۔
وہ تھی تو مڈل کلاس والوں کی بستی۔ہلکی سی آواز بھی ایک دھماکہ پیدا کر دیا کرتی تھی۔موہنی کی ماں کو سب سے پہلے خبر ہو گئی تھی کہ کنویں میں کیا ہو گیا تھا۔پھر یہ بات بھی انھیں فوراً ہی معلوم ہو گئی تھی کہ کنویں میں سے نکال کر وہ کس اسپتال میں لے جائی گئی ہے۔
جب موہنی مری تھی تو دنیا داری کے خیال سے موہنی کی ماں کی پڑوسن بھی اسے دیکھنے گئی تھی،اب خود اس پڑوسن کی لڑکی کنویں میں ڈوب کر مری تھی تو موہنی کی ماں کیسے بیٹھی رہتی۔

موہنی کی ماں وارڈ کے دروازے تک تو پہنچ گئی لیکن لڑکی کے پلنگ تک جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔وارڈ کے دروازے پر کھڑے کھڑے یکا یک اس کو اپنی بیٹی موہنی یاد آ گئی جو پنکھے میں لٹک کر مر گئی تھی۔موہنی کی ماں کے آنسو چھلک آئے۔اسے لگا پلنگ پر سے موہنی اسے پکار رہی ہے،وہ خود کو روک نہ سکی،دوڑی ہوئی ڈوبنے والی کے پلنگ تک گئی۔پلنگ پر پڑی لڑکی کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں،موہنی کی ماں نے گھبرا کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا،کل ہی لڑکیاں ناچتے ناچتے اس سے پوچھ رہی تھیں۔

مچھلی رے مچھلی۔ کتنا پانی؟

موہنی کی ماں نے دیکھا یک وارڈ میں کچھ لوگ اسٹریچر لیکر لڑکی کے پلنگ کے پاس آئے، لڑکی کو اسٹریچر پر ڈال کر مورچری لے جایا جارہا تھا۔ اسپتال میں پلنگ کم تھے۔ وارڈ بوائے تیزاب سے جلی نئی داخل ہونے والی لڑکی کے لیے بستر تیار کررہا تھا۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اب تیزاب تھوکا جاتا ہے اور تیزاب اب پیٹ میں بنتا ہے۔ خون میں دوڑتا ہے اور تھوک کی شکل میں گلیوں گلیوں اُڑتا ہے۔

موہنی کی ماں اس وارڈ کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

اگلا کمرہ آئی سی یو کا تھا۔

باہر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

موہنی کی ماں کھمبا پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔

بھیڑ میں لوگ بتارہے تھے۔ ابھی ابھی ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔

وہ جس کو بھی چھولیتا ہے اس کے بدن پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ موہنی کی ماں کھمبا پکڑے، کانپتی آواز میں نہ جانے کس سے پوچھ رہی تھی۔

مچھلی رے مچھلی۔ کتنا پانی؟

ماں وارڈ کی چوکھٹ پکڑے
کانپتی آواز میں نہ جانے کس سے پوچھ رہی تھی۔
مچھلی رے مچھلی۔ کتنا پانی؟

●●

اوزاروں کا بکس

یہ گناہ گار مولوی، سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے اپنی پاپ بیتی شروع کرے۔ بس یوں سمجھئے کہ پانچ سال معلموں کی چلمیں بھریں، مصلے بچھائے، وضو کے بدھنے بھرے۔ غربت اور کسمپرسی میں ایک سے ایک خرانٹ مفتی کی گھڑکیاں سہیں تب جا کر مولوی بنا مگر ملا کیا؟ مولا گنج کی صدر مسجد میں امامت۔ یعنی بس پانچوں وقت مرغ کی طرح اذان دیتے رہو۔

چلو نماز کو۔

چلو نماز کو۔

یہ تقرری بھی شیدا میاں کی مہربانی ہی تھی۔ اس لئے کہ چودھری جو تھے وہ مولا گنج کی بستی کے۔ کیا چلتا پرزہ آدمی تھا شیدا۔ نام شیدا نہیں تھا تخلص شیدا تھا۔ جھل مل کرتی، شیروانی، دانت کھودنے کے لئے ایک انگلی کے برابر لمبی چاندی کی تلوار گلے میں لٹکتی ہوئی۔ پان اس طرح کھاتا جیسے کیکڑے چبا رہا ہو، فراٹے سے گالیاں اس طرح کی بکتا جو کبھی کسی کے منہ سے سنی نہ گئی ہوں۔ دراصل مولا گنج بستی کے تقریباً سارے ہی مسلمان دریوں کا کاروبار کرتے تھے، خوب پیسہ تھا پڑوس کے شہر کے لوگ انھیں نودولتئے کہتے تھے۔ ان میں سے اکثریت کی جوان اولادیں ان سے چھپ کر داروپیتیں اور یہ بیچارے ایسا ظاہر کرتے جیسے انھیں خبر ہی نہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ مالدار تاجروں کی بستی کی مرکزی مسجد میں پیر ٹکانے کا موقعہ فی الحال قبول کر لینا چاہئے باقی راستے آگے چل کر کھلیں

گے ہی۔ شیدا میاں کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ بیرونی ممالک میں بھی مال درآمد کرنے کا موقعہ کبھی کبھی مل جاتا تھا۔ ایک اولاد نرینہ بھی تھی جس کو گدی پر بٹھانے کے موقعے پر قرآن خوانی کی رسم مجھ سے ادا کروائی گئی حالانکہ اس وقت وہ لڑکا ۱۲ یا پندرہ سال کا تھا اور کالج میں پڑھ رہا تھا۔

شیدا میاں گھر پر مشاعرے کی محفل سجاتے۔ شرکت کرنے والوں کو اپنے دسترخوان پر بٹھا کر متنجن کھلاتے۔ یہ دیکھ کر حجرے میں دال روٹی کھا کر سو رہنے والا یہ کاٹھ کا مولوی شیدا میاں کے زیادہ سے زیادہ قریب آنے کی جگاڑ میں رہنے لگا تھا۔ میری آواز اچھی تھی، گلے میں سُر بھی تھا اس لئے وہ مجھ سے مشاعرے میں حمد اور نعت وغیرہ پڑھوا کر خوب جھومتے تھے۔ ایک دن آخر کار خدا نے میری سن لی۔ رات کے کھانے پر شیدا میاں نے مجھے بھی ساتھ کھانا کھانے کے لئے روک لیا۔ پھر دسترخوان سے فارغ ہو کر مجھے بتایا کہ ان کا بیٹا سمجھدار ہو رہا ہے، اس کی اخلاقی اور خاص طور پر مذہبی تربیت ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی شکایت کی کہ عام طور پر بستی کے دوسرے تاجروں کے لڑکے اواہی تواہی گھومتے ہیں، اللہ رسول کا نام نہیں جانتے، نہ تو خدا سے ڈرتے ہیں نہ اپنے بڑوں کی عزت کرنے سے واقف ہیں پھر وہ سیدھے مطلب پر آ کر بولے۔

"میں ہرگز یہ پسند نہ کروں گا کہ میرا لڑکا مذہب سے بے بہرہ ہو۔ آپ مولوی ہیں اس کو مضبوطی کے ساتھ اللہ کی رسّی پکڑوائیے، نیک اور فرماں بردار بنائیے، فرض شناسی، ایثار اور قربانی کا جذبہ اس میں پیدا کیجئے۔ آپ کو ہر ماہ اس کی اچھی اجرت دونگا"۔ آمدنی کے اضافے کا مژدہ سن کر مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔

میرے لئے یہ بات خوش نصیبی کی تھی کہ میرے شاگرد سلامت میاں اس وقت چودہ، پندرہ سال سے زیادہ کے نہ تھے اور انھیں دین کی طرف لگانے میں زیادہ محنت کی ضرورت نہ تھی۔

کچھ ہی دنوں میں مجھے کچھ کچھ یہ اندازہ ہونے لگا کہ شیدا میاں برابر اس بات کی خبر رکھتے تھے کہ میں سلامت میاں کو کیا تربیت دے رہا ہوں۔ سلامت میاں ذہین تھے اور فرماں بردار بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری تعلیم پر چل نکلے۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے بروقت پڑھنے لگے۔ اسی درمیان ایک اضافہ یہ ہوا کہ شیدا میاں نے اپنے لڑکے کو پابندی کے ساتھ کاروبار کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کی نیت سے گدی پر جلدی جلدی بٹھانا شروع کر دیا۔

ایک دن عجب بات یہ ہوئی کہ شیدا میاں نے مجھے اپنے پاس بلا کر برا سا منہ بناتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا ”یہ سلامت میاں تو پابندی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھ رہے ہیں، کوئی نماز قضا نہیں کرتے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے“ میں نے ان کی بات کا جواب دیا تو وہ اصل مطلب پر آگئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ مال کا سودا کرنے کے لئے باہر سے آنے والے تاجر شام کو جلدی میں ہوتے ہیں، کیونکہ مغرب کے وقت ہی انھیں اپنی جگہوں پر واپس جانے کے لئے گاڑیاں ملتی ہیں لیکن اسی وقت سلامت میاں دھندا چھوڑ کر مغرب کی نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھ لی جائے اور مغرب کے وقت گھر واپس ہونے والے تاجروں کا نپٹارا کر دیا جائے۔

شیدا میاں کی یہ تجویز سن کر میں سٹپٹا گیا۔ احکام الٰہی میں کسی طرح کی ترمیم کرنے والا میں کون ہوتا تھا اس لئے میں نے نہ تو شیدا صاحب کی تجویز پر ہاں کی اور نہ نا کی۔ لیکن شیدا میاں نے جیسے ضد پکڑ لی کہ میں اپنے منھ سے سلامت میاں کو مشورہ دوں کہ وہ مغرب کی نماز قضا پڑھ سکتے ہیں مگر میں خاموش ہی رہا جس پر مجھے اندازہ ہو گیا کہ شیدا میاں مجھ سے کچھ اکھڑے اکھڑے سے ہیں۔ کیونکہ کچھ دنوں بعد انھوں نے مجھ مسجد سے بلا کر یہ خبر دی کہ بستی کی چھوٹی مسجد کے مؤذن کے ذریعے سلامت میاں کو سمجھا دیا ہے اور وہ مغرب کی قضا

پڑھنے لگا ہے پھر شیدا میاں نے شکایت کے لہجے میں یہ بھی کہا۔

''ایک بات میں آپ کو بتا دوں، آپ بھی اپنے اندر کچھ لچک پیدا کریں نہیں تو کیسے کام چلے گا، جس کام کی امید میں آپ سے کروں وہ مجھے دوسرے سے کروانا پڑے تو پھر سوچئے کہ آپ کی کیا ضرورت ہے'' یہ بات میرے دل کو لگ گئی یا یوں کہئے کہ اس بات سے مجھے بڑی نصیحت ملی، لگا کہ شیدا میاں مجھ پر دباؤ ڈال کر شرعی اور مذہبی معاملات میں اپنی سہولیت اور ضرورت کے کام کرانا چاہتے ہیں۔ ایک بار تو میرے دل میں یہ آئی کہ میں نوکری چھوڑ کر مولا گنج سے چلا جاؤں لیکن پھر دل نے کہا کہ جلد بازی ٹھیک نہیں۔ بددل ہو جانے کے باوجود میں بڑی ایمانداری کے ساتھ دھیرے دھیرے سلامت میاں کی کردار سازی میں لگ گیا۔

دھیرے دھیرے دن گزرتے گئے۔ ایک طرف سلامت میاں کو میں اللہ کی رسّی پکڑا رہا تھا اور دوسری طرف سلامت میاں کا تاجر باپ اسے اپنے ڈھرے پر لگا رہا تھا۔ دراصل اب میں شیدا میاں کی پسند اور مزاج وغیرہ کو بہت قریب سے سمجھ چکا تھا لیکن شیدا میاں کی طرف سے ایک تبدیلی اب بہت صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ خاص طور سے مجھ پر کچھ زیادہ ہی التفات برتنے لگے تھے۔ ایک بار میں نے انھیں خاصہ فکرمند اور چپ چپ سا پایا تو پوچھ لیا۔

''آپ چپ چپ کیوں ہیں، خیریت تو ہے''۔

میرے پوچھنے پر وہ خاصے سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ جیسے جیسے سلامت بڑا ہو رہا ہے میری تشویش بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ نئی نسل بڑی خود غرض اور خود سر ہو چکی ہے اسے سادھے رہنا اور اپنے بس میں کئے رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ موروثی پیشے پر لگاؤ تو وہ اپنی سی کرتا ہے اور ایک دن بڑی سفاکی سے آپ کے کاروبار سے آپ ہی کو بے دخل کر دیتا ہے۔ پھر شیدا میاں نے بتایا کہ کچھ دن پہلے سلامت میاں کو تھوڑی دیر کے لئے گدی پر

بٹھایا تھا کیونکہ کالج میں چھٹی تھی تو کہیں سے ایک ضرورت مند آیا اور رو رو کر سلامت کے آگے اپنی پریشانیاں بیان کرنے لگا تو سلامت آبدیدہ ہو گیا اور غلے سے تین سو روپے نکال کر دے دیئے۔ ہمارے سپروائزر نے سلامت میاں کو سمجھایا کہ پیسے درخت میں نہیں اُگتے، تو جانتے ہو سلامت میاں نے کیا جواب دیا، بولا حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے والوں کو اللہ بہت عزیز رکھتا ہے۔ پھر شیدا میاں برا سا منہ بنا کر بولے "ہمارے کارخانے میں کام کرنے والے کئی لوگ حاجت مند ہیں، ہم کو پہلے ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے تاکہ کاریگروں کی پریشانی کم ہو۔ چراغ پہلے گھر میں جلتا ہے یا مسجد میں؟"

ایک دن مولا گنج کی چھوٹی سی بستی میں ایک تاجر کے گھر سے بڑا کہرام اُٹھا۔ گھر والوں کی آہ وزاری کی آوازیں بلند ہوئیں تو سب طرف ہلچل مچ گئی، بہت سے گھروں کے لوگ باہر نکل آئے۔ شیدا میاں نے بھی شوروغل سنا، اس وقت میں اُن کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ شیدا میاں وہ شور سن کر بھی آرام سے بیٹھے رہے لیکن میں بے چین ہو کر پہلو بدلنے لگا۔ یہ دیکھ کر شیدا میاں نے دھیرے سے کہا۔

"یہ بچن بیگ کے گھر کی آوازیں ہیں"۔

بچن بیگ بھی شیدا میاں والا دریوں کا کاروبار کرتے تھے اور بستی کے خاصے موٹے اسامیوں میں سے تھے، ان کے دو جوان لڑکے بھی تھے، شیدا میاں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ نے فائر کی آواز سنی؟"

"فائر کی آواز" میں اُچھل پڑا اور بولا "نہیں تو"۔

"کبھی باپ بندوق نکال لیتا ہے تو بیٹا اسے چھین کر باپ کے سینے پر رکھ دیتا ہے لیکن آج لگتا ہے کہ جس ان ہونی کو ہونا تھا وہ ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بچن بیگ کے جاہل بیٹوں نے کاروبار کے جھگڑے میں باپ کو گولی ماردی۔

اس واقعے کے بعد شیدا میاں کے مزاج کی فطری بشاشی یکا یک غائب ہو گئی۔ وہ خاصے فکر مند سے رہنے لگے۔ وہ میری معمولی سی بھی پریشانی یا الجھن کا تدارک کرنے میں پوری دلچسپی لینے لگے تھے۔ ایک دن وہ ٹوٹے ہوئے دل اور مری ہوئی آواز میں مجھ سے بولے۔

''مولوی صاحب پیسہ بہت بری چیز ہے، پیسے کی فراوانی آج کی نئی پود کو سرکش اور بزرگوں کے خلاف باغی بناتی ہے۔ اور یہ بغاوت وہ ایسے وقت پر کرتی ہے جب ہم ناطاقتی کا شکار ہو کر ذہنی اور جسمانی طور پر کھوکھلے ہو چکتے ہیں۔ میں بھی ایک بیٹے کا باپ ہوں، مجھے اپنے بیٹے کی طرف سے بھی یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ ایک دن مجھے بھی کاروبار سے دست بردار کر کے ہمیشہ کے لئے ایک کونے میں بٹھا کر اپنی من مانی نہ کرنے لگے۔ ہمارے پاس اگر کوئی چیز ڈرانے والی بچی ہے تو خدا کے خوف کے علاوہ اور کیا ہے اور اگر کوئی چیز لبھانے والی اب بھی قائم ہے تو وہ جنت کا تصور ہے۔ اولاد کی مذہبی تعلیم ہی اولاد میں اپنے بزرگوں کی عزت اور محبت پیدا کرتی ہے اور ان کے دل میں پیسے کی اندھی لالچ کو گھر نہیں کرنے دیتی اور یہ اصلاحی کام ایک مولوی سے بڑھ کر بھلا کون کر سکتا ہے''۔

یہ سن کر میں بڑی تندہی سے سلامت کی اصلاح میں لگ گیا۔ مگر ایک دن شیدا میاں نے ایک عجیب بات کہہ دی تو میں سوچتا رہ گیا۔ سلامت کی مذہبی تعلیم میں کس نہج سے کر رہا ہوں اس پر شیدا میاں کی ہمیشہ نظر رہا کرتی تھی۔ ایک دن پتہ نہیں کہ کیا ہوا یا انھیں کونسی بات ناپسند ہوئی کہ وہ مجھ سے بولے۔

''مولوی صاحب آپ سلامت میاں کی تربیت میں اُن باتوں پر زور دیتے ہیں جن کی ادائیگی میں سلامت کی عاقبت بنتی ہے، اس کے باپ کی نہیں اس لئے آپ تو اُسے ایسی تعلیم دیجئے جس سے مجھے نقصان کے بجائے فائدہ ہو نہ کہ سلامت کو''۔ یہ سن کر میں سمجھ گیا

کہ شیدا میاں دراصل اپنی حفاظت کے لئے اپنے لڑکے کو اللہ والا بنوا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک تجربہ کار بزرگ اور شہرت یافتہ مجتہد مولانا شرافت علی سے انھیں دنوں میری ملاقات ہوگئی۔ وہ مولانا عمل وغیرہ کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے، انہوں نے ایک عمل کی مشق کرنے کا مجھے مشورہ دیا جس سے کہ میری آنکھوں میں ایک عامل کی سی قوت اور کشش پیدا ہوئی تھی، یہ بھی مشورہ دیا کہ میں اپنا معمول سلامت کو بناؤں جو عالم خواب میں جگہ جگہ کی سیر کر سکے۔

بہر حال میں نے سارے پہلو سوچ کر سلامت کے دل میں ان کے ماں باپ کے لئے احترام اور محبت پیدا کرنے اور اس کے بدلے جنت میں جگہ پانے کے خیال کو پختہ کرنے کی کوشش شروع کی لیکن جنت کا تصور اور وہ بھی لبھاؤنا تصور سلامت کے دماغ میں بٹھانے کے لئے مجھے بار بار مشقیں کرنا پڑیں، اس کے بعد میں نے اللہ کا نام لیکر سلامت میاں کو اپنے حجرے میں بلا بلا کر اور فرش پر لٹا اور سلا کر ان کے خیالوں میں جنت کا نقشہ بٹھانے کی کوششیں اور مشقیں شروع کر دیں، کچھ عرصے بعد مجھے لگا کہ سلامت میاں کے اندر جنت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جاننے کی خواہش بیدار ہونے لگی تھی۔ پھر تو ایک دن میں سلامت کو اپنے حجرے میں لے آیا اور اس کو جنت کی وہ سیر کرانے پر آمادہ کر لیا جو میں کرانا چاہتا تھا۔ میں نے سلامت کو سلا کر اس سے معلوم کیا کہ کیا وہ جنت پہنچ گیا، اس کا جواب تھا ہاں پہنچ گیا، میں نے پوچھا وہاں کیا دیکھ رہے ہو اس کا جواب تھا باغ، نہریں، حور اور غلمان۔ جواب سن کر میری طبیعت خوش ہوگئی، بس میں اسی جگہ رک گیا کیونکہ وہ تو ایک امتحان تھا۔ اس کے بعد میں نے سلامت کو پابند کیا کہ وہ ہر جمعرات سب کام چھوڑ کر قبرستان کے باہر بیٹھے فقیروں کو دو روٹی خیرات کیا کرے۔ سلامت نے وہ خیرات پابندی کے ساتھ شروع کر دی۔ روٹیاں خیرات کرتے ہوئے جب لمبا عرصہ گزر گیا تو ایک دن میں نے پھر اسے حجرے میں بلا کر اور عمل کے ذریعے

فرش پر بے ہوش کر کے اس کا آخری امتحان لیا اور پوچھا

''سلامت میری آواز سن رہے ہو، کیا تم جنت میں پہنچ گئے، وہی خوبصورت جنت جس کا ذکر میں تم سے کرتا رہا ہوں۔ جواب ملا۔ ہاں، میں جنت میں ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں خوبصورت عمارتیں دکھائی دے رہی ہوں گی۔

جواب ملا''ہاں دکھائی دے رہی ہیں''۔

''مجھے یقین ہے کہ تم ایک بڑی عمارت کے ٹھیک سامنے کھڑے ہو''

ہاں میں کھڑا ہوں۔ جواب ملا۔

مجھے امید ہے کہ وہ ایک گودام کی عمارت ہے۔ اس کے دروازے پر بیٹھے دربان سے پوچھو۔

''پوچھ لیا۔ وہ گودام ہی ہے''۔

میں نے حکم دیا۔ اے سلامت میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ عمارت کے اندر جاؤ اور غور سے دیکھو کہ وہ روٹیوں سے تو نہیں بھرا ہے۔

سلامت کا جواب تھا۔ ہاں چھت تک روٹیاں ہی بھری ہوئی ہیں۔

میں نے وقت ضائع کئے بغیر سلامت کو بتایا۔ یہ وہ روٹیاں ہیں جو تمہاری خیرات کی ہوئی روٹیوں کے بدلے میں اللہ نے تمہیں پانچ گنا زیادہ دی ہیں۔ یاد رکھو تم جو کچھ بھی دنیا میں اپنے ماں باپ کے ساتھ کرو گے اللہ تمہیں اس سے پانچ گنا زیادہ جنت میں دے گا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شیدا میاں اپنے اکلوتے بیٹے پر بہت مہربان تھے اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا جتن کرتے رہتے تھے۔ ان کو سلامت کی تعلیم کی کوئی خاص فکر نہ تھی لیکن سلامت یونیورسٹی پہنچنے کے بعد لڑکے لڑکیوں کے مخلوط درجوں میں بڑی کشش محسوس کر رہا تھا اور پابندی سے کالج جا رہا تھا۔ شیدا صاحب نے بھی اسے کھلی چھوٹ

دے رکھی تھی ، وہ بھی اس شک میں کہ کچھ بھی خلاف مرضی ہونے پر لڑکا کہیں باغی نہ ہو جائے۔ وہ بار بار مجھے بلا بلا کر یہ معلوم کرتے رہتے تھے کہ سلامت کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سلامت کے زیادہ سے زیادہ قریب رہوں تاکہ ان کے پوچھنے پر سلامت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتا سکوں۔ کاروبار کو لے کر شہر میں ہونے والے کاموں کے سلسلے میں اپنی جگہ شیدا میاں سلامت کو ہی کبھی کبھی بھیج دیا کرتے تھے۔ آگے چل کر ایسا ہوا کہ شیدا میاں نے سلامت کے ساتھ مجھے بھی بھیجنا شروع کر دیا۔ پہلی بار جب میں سلامت کے ساتھ شہر گیا تھا تو وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا لیکن بعد میں اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ شہر میں کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے ان باتوں کا ذکر میں کسی طور بھی شیدا میاں سے نہ کروں۔ سلامت کی اس شرط نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے لگا کہ میرے لئے وہاں اب مشکلات بڑھنا شروع ہو رہی تھیں کیونکہ حالات مجھ سے ایک ہی وقت میں باپ اور بیٹے کا وفادار بنے رہنے کا تقاضہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے ضمیر کی آواز کے ٹوکنے پر بھی میں نے خود کو نہ روکا اور جیسا چل رہا تھا اسے خاموشی سے چلنے دیا کیونکہ صورت حال کی تبدیلی میں یا تو باپ سے یا پھر بیٹے سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پھر ہوا یہ کہ انھیں دنوں مجھے یکا یک یہ پتہ چلا کہ ہم سلامت میاں کو عمر میں جتنا چھوٹا سمجھتے تھے وہ اب اتنے چھوٹے نہیں رہ گئے تھے کیونکہ ایک دن شہر میں کام کے بعد ہوٹل میں جب کھانا کھایا تو ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ سلامت میاں نے اسے مجھ سے یہ کہہ کر ملوایا کہ وہ یونیورسٹی میں ان کی ہم جماعت ہے اور نام اس کا زبیدہ ہے۔ وہ متوسط طبقے کی تھوڑی تیز طرار لڑکی مجھے نظر آئی کیونکہ تعارف کے بعد اس نے سلامت سے میرے بارے میں تفصیل سے معلومات کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں مولوی ہوں اور سلامت کی بستی کی مسجد میں مؤذن ہوں اور میں ہی سلامت کو جنت کی سیر کرانے میں مدد کرتا ہوں تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ سلامت سے انگریزی زبان میں کچھ اس

طرح بولنے لگی جیسے سلامت کے ساتھ میری موجودگی کو ناپسند کر رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید سلامت کسی موقع پر زبیدہ سے میرا غائبانہ تعارف پہلے کبھی کرا چکا ہو اور یہ بھی بتا چکا ہو کہ میں نے کس طرح اس کو جنت کی سیر کرائی تھی۔ سلامت کا زبیدہ سے مجھکو ملوانا میرے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ سلامت کو مجھ پر یہ اعتماد ہو چکا ہے کہ میں اس کا ہر راز اپنے سینے میں محفوظ رکھونگا۔ اور ایسا تھا بھی کیونکہ ایسا نہ کر کے کچھ اور کرنا ممکن تو تھا مگر حالات کے مطابق میری طاقت اور حوصلے سے باہر تھا۔ زبیدہ سے ملاقات کے بعد ایک شام سلامت میاں میرے حجرے پر آئے اور بہت لگاوٹ اور محبت کی باتیں کرنے لگے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ ان کے دل میں میری بڑی عزت ہے اور انھیں یہ بھی یقین ہے کہ میں ان کا سچا راز دار بھی ہوں اور مددگار بھی۔ میں نے بھی ان کو یہ یقین دلایا کہ جیسا وہ سمجھتے ہیں ویسا ہی ہے تو انھوں نے یہ بھید کھولا کہ زبیدہ ان سے محبت کرتی ہے اور ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اسے جی جان سے چاہتے ہیں لیکن پریشانی یہ ہے کہ زبیدہ چاہتی ہے کہ شادی سے پہلے اپنے باپ کی بزنس پر جلد سے جلد قابو ہی نہیں پالیں بلکہ اپنے ماں باپ سے بھی دست بردار ہو کر اپنی الگ اور آزاد زندگی گزاریں جس میں زبیدہ کے علاوہ کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہو۔ اس کے بعد ہی زبیدہ سلامت کے نکاح میں آنا پسند کرے گی۔

یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے سلامت میاں کو مشورہ دیا۔

"آپ کہیں تو میں زبیدہ سے مل کر اُسے سمجھاؤں کہ ماں باپ کے بڑھاپے میں اولاد کا ان سے دست بردار ہونا اور انھیں بے سہارا چھوڑنا اللہ کو سخت ناپسند ہے"۔ یہ سن کر سلامت میاں فوراً بول پڑے "یہی تو مشکل ہے۔ زبیدہ مذہبی دلیلوں کو نہیں مانتی، وہ کہتی ہے کہ میں مولوی کو کیوں دُم میں باندھے رہتا ہوں۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتی ہے، آپ اس سے بات کریں گے تو وہ کہے گی" آپ کے مشورے پر سلامت میاں کے ماں باپ کو سینے پر دھرے بیٹھی رہی تو جب تک جنت میں نہ پہنچوں گی دو من کا بوجھ آپ اس کے سینے

پر سے نہ اتاریں گے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ماں باپ کو قرآن کا کوئی فرمان بتا کر اور بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہو جانے کا واسطہ دے کر آرام کرنے کے لئے راضی کر لیں،، مگر میری مشکل یہ تھی کہ اولاد کو اس کے ماں باپ کو منجدھار میں ڈبونے کا حکم کہیں نہیں دیا گیا تھا۔ اب جب کہ یہ تحریر میری خود نوشت کا ایک حصّہ ہے مجھے ہر بات ایمانداری سے لکھنا ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس گھر میں ایک ایسی عورت کا راج ہونے والا ہے جو مجھے دروازے پر ہی نہ پھٹکنے دے گی مجھے دھڑکن ہونے لگی اور اتنا یقین تو مجھے ہو ہی گیا کہ اب میرا آب و دانہ مولا گنج سے اُٹھ گیا ہے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ میرے دیکھتے دیکھتے بہت تیزی کے ساتھ زبیدہ سلامت کے حواس پر چھاتی چلی گئی یہاں تک کہ سلامت میاں کے پاس میرے لئے بھی کوئی وقت نہ رہ گیا۔ اُدھر شیدا میاں بیٹے کا کاروبار اور کارخانے کے کاموں میں پس پردہ زبیدہ کے مشورے پر کوئی اختراع کرتے ہوئے دیکھتے تو سمجھ جاتے اور بہت زیادہ چڑچڑاتے اور شور مچاتے لیکن بیٹا اپنے فیصلے اور ارادے میں کوئی تبدیلی نہ لاتا۔ اس طرح روز روز کی چپقلش سے تنگ آ کر شیدا میاں نے آخر کار کاروبار پر نظر رکھنا ہی بند کر دی اور دل ہی دل میں کُڑھ کُڑھ کو اپنی صحت بھی بگاڑ لی۔ یہی نہیں بلکہ ایک دن انھوں نے مجھے دوغلا اور سلامت کا طرفدار بتا کر مجھ سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

کیونکہ مولا گنج میں کوئی معقول مدرسہ نہ تھا اس لئے میں آس پاس کے علاقوں کے مدرسوں میں ملازمت کی تلاش میں چپکے چپکے چکر کاٹتا رہا۔ ممکن تھا کہ کسی کو بتائے بغیر میں مولا گنج سے چپ چاپ نکل بھاگتا کہ ایک دن سلامت میاں نے بڑی رازداری کے ساتھ مجھے اپنے پاس بلایا اور خاموشی سے اطلاع دی کہ انھوں نے زبیدہ کی خواہش پر کسی کو بتائے بغیر شہر میں ایک پلاٹ زبیدہ کے لئے خریدا ہے اور وہ دھیرے دھیرے اس پر ایک گھر بنانا چاہتے ہیں اور اس کام کی دیکھ ریکھ وہ میرے سپرد کر رہے ہیں جس کا مجھے معقول محنتانہ بھی ملے گا۔ میں نے سلامت سے یہ پوچھے بغیر کہ اس مکان کے لئے پیسہ

کہاں سے آئے گا، مسجد میں ایک لڑکے کو اذان وغیرہ کا پابند کر کے شہر میں تھوڑے وقفے کے لئے تعمیر کے کام میں لگ گیا لیکن بعد میں نہ جانے ایسا کیا ہوا کہ سلامت میاں نے اس کام کو ادھورا چھوڑ کر یکایک زبیدہ سے بالا بالا ہی شادی کرلی۔ پتا چلا کہ زبیدہ کے ضعیف والد کا لمبی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا جس کے سبب زبیدہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اس شادی کے بعد میں نے دیکھا کہ شیدا میاں کے گھر میں آئے دن آہ و بکا اور اتنا شور رہنے لگا جو زبیدہ کا پیدا کردہ ہوا کرتا کیونکہ وہ آہ و بکا کے ساتھ یہ تناؤ پیدا کر کے ہی گھر میں اپنے لئے جگہ بنا رہی تھی اور جب وہ جگہ بن گئی تو تناؤ بھی ختم ہو گیا۔

بہر حال خود کی نظروں میں گر جانے کی تکلیف سے اوب کر میں نے سوچا کہ میں اپنی جانماز بغل میں دبا کر اور اپنی بدھنی کندھے پر لٹکا کر سیدھا زبیدہ سے بات کروں اور اس سے صاف کہہ دوں کہ اب میں وہاں ایک پل نہ رکوں گا۔ میں نے یہ سوچ کر جانماز بغل میں دبائی، بدھنی کندھے سے لٹکائی اور کھڑا ہو گیا تو یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس قدر قلیل بوجھ کے سامانوں کے ساتھ میں زندگی کر رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی میں خود کو اپنی نظروں میں گراتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں زبیدہ کے سامنے رخصت کی اجازت کے لئے اس امید میں کھڑا تھا کہ میں اس کے لئے ایک خرافاتی مولوی سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ وہی عورت تھی جس نے ایک بار تیوریاں چڑھا کر ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے سلامت کے سامنے مجھ سے پوچھا تھا ''مولوی صاحب ایک بات پوچھوں، آپ بتائیں گے؟''

''پوچھئے''۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ نے سلامت کو خواب میں جنت کی سیر کرائی تھی''۔ یہ سن کر سلامت میاں جلدی سے بول پڑے تھے ''ارے اب اس بات کو چھوڑ دو''۔

''کیوں چھوڑ دو'' وہ تنک کر بولی تھی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''سلامت بتا رہے تھے کہ ہر جمعرات کو وہ فقیروں کو روٹیاں تقسیم کرتے تھے۔ جن کا پانچ گنا اجر جنت میں ان کے لئے ایک گودام میں بھر کر روٹیوں کی ہی شکل میں ان کے انتظار میں رکھا ہے''۔

''وہ تو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پورا گودام روٹیوں سے بھرا ہوا تھا''۔ سلامت نے گواہی دی تب زبیدہ نے سلامت کی گواہی پر توجہ نہ دے کر مجھ سے سوال کیا تھا۔

''مولوی صاحب سلامت نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ روٹیوں سے بھرے گودام کا جنت میں کیا کریں گے، کیا وہاں بھی فقیر ہوتے ہیں یا وہاں بھی لوگوں کو روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں''۔ اتنا کہہ کر اور مجھ پر حقارت بھری ایک نظر ڈال کر وہ ہاتھ دھونے چلی گئی تھی۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ جو عورت نہ جنت کو مانتی ہو اور نہ جنت میں ملنے والے اجر کو، وہ اپنی عملداری میں میرے وجود کو کیسے برداشت کرے گی، اس لئے مجھے پکا یقین تھا کہ میری گلو خلاصی میں دیر نہ لگے گی لیکن جو کچھ ہوا وہ تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر بجلی سی گرا گیا کیونکہ جیسے ہی میں نے زبیدہ کو یہ بتایا کہ میں مولا گنج سے اب جا رہا ہوں اور رخصت کی اجازت لینے آیا ہوں تو چونک کر اُس نے پوچھا۔

''کیا آپ مسجد چھوڑ کر جا رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''کیوں؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولی، تو میں نے بھی ہمت کر کے کہہ دیا

''کیونکہ نہ آپ جنت کو مانتی ہیں اور نہ جنت میں ملنے والے اجر کو''۔

یہ سن کر زبیدہ نے مجھے غور سے دیکھا پھر میری گستاخی کو درگزر کر کے مسکرائی اور بولی۔

''وہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے'' پھر لگاوٹ کے ساتھ نرم آواز میں بولی ''بستی کی سب سے بڑی مسجد ہے جو ہماری موروثی دیکھ ریکھ میں ہے، بدنامی ہو رہی ہے کہ شیدا میاں نے کوئی دینی کام کر کے مسجد کو آباد نہ کیا، اس پر اب آپ بھی مسجد چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں وہاں مدرسہ قائم ہو، بچوں کو قرآن حفظ کرانے کا انتظام ہو، آپ کی تنخواہ بڑھا کر یہ ذمہ داری آپ ہی کو سونپیں''۔

یہ سن کر میں ہکا بکا ہو کر انھیں دیکھنے لگا تو وہ جلدی سے بولیں۔

''آپ فکر مند نہ ہوں۔ قرآن کے معنی اور مطلب نہیں بتانا ہیں، صرف سیپارے رٹانے کا ہی کام کرنا ہے''۔

یہ سن کر میں بری طرح سٹپٹا گیا، اس حالت میں مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ زبیدہ کے دل میں قرآن کی تشہیر کے لئے ایسے جذبات چھپے تھے، میرے منھ سے یکا یک نکل گیا۔

''جزاک اللہ۔ جزاک اللہ'' وہ خوش ہو کر بولیں۔

''آپ کی لیاقت کا علم ہے مجھے، مولا گنج میں میئر کے الیکشن سے پہلے مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے کیونکہ کیسے بھی ہو مجھے الیکشن بھی جیتنا ہے اور میئر بھی بننا ہے۔

یہ سن کر میں زبیدہ کا منہ دیکھنے لگا۔ الجھن اور گھبراہٹ میں ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ یہ دیکھ کر زبیدہ نے مجھے نصیحت کی کہ میں مسجد کی آرائش اور زیبائش کے لئے اور دوسری چھوٹی ضرورتوں کے لئے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے بستی میں مسجد کے چندے کے لئے خود بھی لگنا چاہئے اور دوسروں کو بھی لگانا چاہئے۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا تو زبیدہ کی آواز آئی۔

''آپ سے مسجد کی پہچان نہیں ہے، مسجد سے آپ کی پہچان ہے۔ ابھی تک آپ نے یہ نہیں جانا ہے کہ یہ عمارت اوزاروں کا ایک بہت بڑا صندوق ہے، کونسا اوزار اپنے لئے کب اور کہاں استعمال کیا جائے اس کاریگری کو سیکھنا بھی ضروری ہے۔'' میں نے سنا

اور گردن جھکالی۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

بہت چھوٹا آدمی ہوں۔اب تو بال سفید ہونے کو ہیں مگر اس طلسمی صندوق کے اوزاروں کو جب ابھی تک پہچاننے کا سلیقہ بھی اس حقیر فقیر کو نہ آیا تو اب اور کب آئے گا؟

●●

زہر پاش طیارے

کل جو کچھ اس نے لکھا وہ بس چند سطریں تھیں۔ ان سطروں کو وہ بس یونہی دیکھتا رہا پھر بے دلی سے انھیں پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

''سیریا ایک ملک ہے جیسے ہندوستان ایک ملک ہے۔

وہاں بچے بھی ہیں اور عورتیں بھی، جیسے کہ ہندوستان میں ہیں۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے کلورین گیس فضا میں چھڑکیں تو ہندوستان میں بھی قصوروار اور بے قصور، بوڑھے اور بچے چوہے بلی کی طرح ویسے ہی مریں گے جیسے سیریا میں مرے تھے۔ تڑپ تڑپ کر، ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی تعداد میں جتنے جلیانوالے باغ میں جنرل ڈائر نے مارے تھے''۔

آگے عبارت خاصی کٹی پٹی تھی لیکن نیچے کی سطروں میں پھر صاف صاف لکھا تھا۔ آنکھیں چاہے سیریا کی ہوں یا ہندوستان کی قدرت نے آنکھوں کو بنایا ہی اس لئے ہے کہ وقت ضرورت ان میں آنسو آجائیں۔ آنکھیں بھگونے کی ضرورت سے کسی ملک کے باشندوں کو اور کسی زمانے کو مفر نہیں ہے۔

آگے کی عبارت پھر کچھ کٹی پٹی تھی۔

اسے پڑھنے کے لیے وہ ابھی آنکھوں پر زور دے ہی رہا تھا کہ گھر والوں سے اُسے خبر ملی کہ ہوا میں آنے والی کالی آندھی کی بو کو بڑے بوڑھوں نے محسوس کرلیا ہے، باہر پھیلے کپڑے الگنیوں سے اتار لئے گئے ہیں اور کھڑکیاں دروازے بند کرلئے گئے ہیں لیکن آندھیوں کو لاکھ روکا گیا مگر وہ گھس کر توڑ پھوڑ کرنے سے باز کہاں آتی تھیں۔

یکا یک کالی آندھیوں کو بھول کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا!
حالات آنکھیں بھگو دیتے ہیں۔
ثبوت اقوام متحدہ کے ممبران کی وہ آنکھیں ہیں جو کلورین گیس کے چھڑکاؤ سے سیریا میں بچوں اور عورتوں کا تڑپ کر مرنے کا تماشہ ویڈیو میں دیکھ کر بھیگ گئی تھیں۔ بس ایک اچھی بات یہ ہے کہ آنکھیں ہمیشہ ہی بھیگی نہیں رہا کرتیں، تھوڑی دیر بعد خشک بھی ہو جاتی ہیں۔

وہ ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ سگار پیتا تھا۔ بیس سال تک پیتا رہا۔ ایک دن ڈاکٹر نے بڑے تیوروں کے ساتھ اس پر جملہ کسا!

''مرنا ہے تو سیدھے مرجاؤ۔ یہ ایڑی رگڑ کر مرنے کا شوق کیوں چرایا ہے۔''
بس اس کے بعد سے اس نے سگار چھوڑ دیا۔ ان دنوں بار بار اس کے دماغ میں مولوی بشیر الدین کا خیال آتا تھا۔ اسے لگتا کہ مولوی قرآن شریف اور دینیات پڑھاتے پڑھاتے اس کی بیوی اور بیٹے سے جونک کی طرح چپک گیا ہے اور ان لوگوں کو سگار کی طرح مولوی بشیر الدین کی لت پڑ رہی ہے۔ وہ بڑبڑایا۔
''جس طرح میں نے سگار پینا چھوڑ دیا، ہمت کر کے مولوی بشیر الدین سے بھی چھٹکارا حاصل کر لوں'' اسی وقت ان کی گھر کی چھت کے اوپر کافی نیچی اُڑان کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر اُڑان بھرتے ہوئے گزرا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مولوی بشیر الدین اور ہیلی کاپٹر کے بیچ کیا رشتہ ہے۔ جب بھی مولوی بشیر الدین یاد آتے ہیں تب ہی اسے ہیلی کاپٹر کا خیال کیوں آتا ہے، شاید اسی لئے یکا یک اسے وہ ہیلی کاپٹر یاد آگئے جنھوں نے سیریا کی عورتوں اور بچوں پر کلورین گیس چھڑک کر پوری آبادی کو چوہوں کی موت مارا تھا۔

اسے بتایا گیا تھا کہ کلورین گیس گرانے والے ہیلی کاپٹر عام ہیلی کاپٹروں سے بناوٹ میں قدرے مختلف ہوا کرتے ہیں اور ریاست (State) کے علاوہ کوئی عام ایجنسی نہ تو انھیں اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور نہ ان کا استعمال کر سکتی ہے۔

وہ ابھی انھیں خیالات میں گم تھا کہ کال بل بجنے کی آواز آئی۔

وہ کچھ متفکر انداز میں گردن گھما کر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کو حیرت تھی کہ اس کی بیوی نے گھنٹی کی آواز سے ہی آنے والے کو پہچان لیا تھا۔ وہ بڑبڑائی مولوی صاحب آ گئے اور لپک کر دروازہ کھولا۔ وہ غلط نہ تھی دروازے پر ان کے بیٹے سلو کو دینیات پڑھانے والے مولوی بشیر الدین کھڑے تھے۔ سلو کی ماں حیرت سے بولی۔

''کیا ضرورت تھی آندھی میں آنے کی'' سلو کی ماں کو جواب ملا۔

''کل بھی نہیں آسکا تھا۔ آج بھی ناغہ ہوتا تو دل ملامت کرتا''۔ مولوی کو پڑھانے کی لت سی پڑ گئی تھی اور یہ لت وہ اپنے شاگردوں میں بھی ڈالنا چاہتا تھا۔ سلو کے باپ نے آہٹوں کی طرف کان لگائے۔ ان آہٹوں سے سلو کے باپ کو پتہ چلتا رہا کہ اب مولوی بشیر الدین کو عزت سے بٹھایا گیا ہے، اب بارہ برس کا ان کا بیٹا سلو جلدی جلدی وضو کر کے اور جالی دار ٹوپی پہن کر اور معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر بھیگی بلی بنا بشیر الدین کے سامنے بیٹھ رہا ہے۔ یہ کام شروع شروع میں وہ ماں کے خوف سے کرتا تھا پھر اس کو مولوی صاحب سے پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔ پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے مولوی بشیر الدین کو اپنے باورچی خانے سے ناشتہ بھی دینا شروع کر دیا، کہتی۔ وہ حافظِ قرآن ہیں ان کی خاطر داری سے رحمت بڑھے گی۔ مولوی صاحب بھی پھر سب کچھ چھوڑ کر اور دونوں گال بھر بھر کر پراٹھوں کا ناشتہ کرتے۔ ایک دن اس نے بیوی سے پوچھ لیا یہ سوکھا سا کھا تاڑ کی طرح لمبا اور بکرے جیسی داڑھی والا مولوی کیا چیز ہے۔ بیوی نے اپنی معلومات کا خزانہ کھول دیا۔

''یہ آدمی کیسے بھی موسم میں تعلیم کے لیے اپنے گھر سے مدرسہ تک پہنچنے کے لیے ایک دریا اور تین گندے نالے مسلسل پار کرتا رہا ہے۔ ان نالوں سے اسے جلد کی بیماریاں ہو گئیں، غریب ابھی بھی دادکھاج کا شکار ہے۔

جب اس نے بیوی سے یہ معلوم کیا کہ وہ اکثر مولوی کو ناشتے میں بڑے جانور کے

گوشت کے کباب بھی کھلاتی ہے تو اس نے بتایا کہ گوشت کے بغیر مولوی کا نوالہ نہیں اُٹھتا۔ ۳ روپیے کے قصائی کے یہاں سے پھیپھڑے لا کر ان کا سوپ بنا کر اس میں روٹی بھگو کر کھاتا ہے۔ کہتا ہے میں نے طمع کو مار دیا ہے، کوئی نماز نہیں قضا ہوتی۔ کیسی بھی سردیاں ہوں کسی نے ان کے بدن پر کوئی گرم کپڑا نہیں دیکھا۔ کہتا ہے ایمان مضبوط ہے تو سب کچھ مضبوط ہے۔ ایک بار سلّو کی والدہ کے کان میں درد اُٹھا تو اس نے ان کے کان میں چاروں قل چپکے چپکے پڑھ کر سلّو کی ماں سے یہ ہدایت کی کہ وہ شریعت پر چلے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنا قریب منہ لانے پر سلّو کی والدہ کو یہ احساس ہو گیا کہ شاید بشیر الدین کو پائیریا کا مرض ہے کیونکہ اس کے منہ سے بو آ رہی تھی۔

ایک دن اس نے سلّو کی ماں کے سامنے ہی سلّو سے پوچھ لیا۔

"بتاؤ آج مولوی صاحب نے کیا پڑھایا؟"

"وہ بہت اچھے سے سمجھاتے ہیں" سلّو نے جواب دیا اور سمجھانے کی تفصیل یہ بتائی کہ مان لیجیے مولوی صاحب آسمان پر ہیلی کاپٹر میں اُڑ رہے ہیں اور سلّو میاں ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر اپنے بچاؤ کے لیے مدد کے طالب ہیں تو مولوی کا یہ فرض ہے کہ ہیلی کاپٹر سے جلتے مکان کی چھت پر ایک رسّی گرا کر سلّو کو پکڑا دے اور سلّو اسے پکڑ کر ہیلی کاپٹر میں محفوظ چلا آئے۔

تفصیل بتا کر سلّو تو چمپت ہو گیا لیکن اس کا باپ، ہیلی کاپٹر، رسّی اور جلتے ہوئے مکان کے رشتوں کو سوچتا ہی رہ گیا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ان کے ایک پڑوسی عبدالکریم ٹھیکیدار گپ شپ کرنے ان کے پاس آ گئے۔ عبدالکریم ٹھیکیدار مخلص اور محنتی انسان تھے۔ پریشانی کے دنوں میں انھوں نے سلّو کی بہن افشاں کو گود لیا تھا۔ ایک دن سلّو کے باپ نے عبدالکریم ٹھیکیدار سے پوچھا۔

"آپ نے ہی مولوی بشیر الدین کو سلّو کو پڑھانے کے لیے رکھوایا ہے۔ ذرا آپ ہی اس کہانی کا مطلب بتایئے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے وہ کہانی بیان کی جو مولوی صاحب

نے ان کے بیٹے سلو کو سنائی تھی۔ مولوی صاحب کا ہیلی کاپٹر میں اُڑنا، سلو کا ایک جلتے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر مدد کے لیے پکارنا، مولوی صاحب کا رسّی پکڑانا، سلو کا رسّی پکڑ کر ہیلی کاپٹر پر محفوظ پہنچ جانا وغیرہ۔

عبدالکریم ٹھیکیدار کا جواب تھا کہ یہ کہانی تو مولوی صاحب ان کے بچوں کو بھی سنا چکے ہیں۔ اس کا مطلب بالکل سیدھا ہے، ہیلی کاپٹر میں بیٹھے مولوی صاحب اللہ پاک کی جانب سے ملنے والی غیبی امداد کے مانند ہیں۔ رسّی سے مراد اللہ کی رسّی ہے یعنی اللہ کی نیک ہدایت سے اور جلتے ہوئے مکان کی چھت سے مراد دوزخ کی آگ ہے گویا اللہ کی رسّی پکڑا کر بندے کو دوزخ سے محفوظ رکھنا مولوی صاحب کا کام ہے۔

یہ باتیں کرکے عبدالکریم ٹھیکیدار نے انگوچھے سے اپنا منہ پونچھا۔ غلہ جیسی دو بڑی بڑی آنکھیں قدرے طیش میں باہر نکالیں اور گلا دبا کر بولے۔

"میں پڑھا لکھا تو آپ کی طرح نہیں ہوں لیکن اس کمینی اور کُتّی دنیا کو ہر دم دیکھ رہا ہوں سوتے میں بھی آنکھیں پھاڑے اس پر نظر رکھتا ہوں۔ بیہڑ جنگلوں میں سانپ بچھوؤں اور بے وفا اندھیروں سے دوستی کر کے رہزنوں اور شیر چیتوں کی جان لیوا گھاتوں سے بچنے بچانے کی کوشش میں بھی دنیا پر سے نظر نہیں ہٹاتا۔ میں نے کیا محسوس کیا ہے بتاؤں آپ کو؟"

یہ کہہ کر عبدالکریم مسکرائے۔

اس مخلوق کے لیے ہم سب نے تھوڑی دیر کے واسطے اپنے اپنے کام بانٹ لئے ہیں جو آج قتل کرنے کا کام کرتا ہے۔ وہی قتل ہوجانے کے کام میں لگ جاتا ہے۔ جو آج اُجاڑنے کا کام کرتا ہے، وہی کل بسانے کے کام میں لگ جاتا ہے۔

اس دنیا کی تو سالی ماں کی ...... ٹھیکیدار کے منہ سے موٹی سی گالی نکلی۔ پھر گالی بھرے تھوک کو کمرے کی زمین پر تھوکا اور انگوچھے سے ہونٹوں پر گالی ملے لعاب کو پونچھتے ہوئے فوراً واپس لوٹ گئے۔ وہ دروازے کو تکتا ہی رہ گیا۔

اگلی صبح جب سلّو کا پروفیسر باپ ٹھیکیدار کے دنیا کے علم کے نیچے دبا کچلا ہاتھ پیروں میں درد کے ساتھ اُٹھا تو اس سے اُٹھا نہ گیا۔ بیوی چائے لیکر آئی تو منع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد افشاں کے ہاتھ بھیجنے کی ہدایت کی۔ افشاں اس کی بڑی بیٹی تھی اور اوبیرائے (O B I R A E) کے ہوٹلوں سے ہوٹل مینجمنٹ (Hotel Management) کا کورس کیا تھا۔ وہ ان دنوں چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد افشاں چائے لے کر آئی۔ وہ بیٹی کو آنکھ بھر کر کچھ دیر دیکھتا رہا۔ چتونوں میں اعتماد کی لپلپاتی ہوئی ایک برقی قوت تھی۔ آواز میں جوانی کی کھنک تھی۔ اس نے افشاں کو بڑی آرزوؤں کے ساتھ پالا تھا، اس کا کیریر بنانے میں اپنی کھال تک اُدھڑوا دینے میں بھی دریغ نہ کیا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر باپ کو ایک بار پھر اس کی رہائش کا مسئلہ یاد آگیا۔ ٹریننگ کے دوران افشاں ہوٹل کے اسٹاف ہاٹل میں رہتی تھی۔ لیکن تربیت مکمل ہونے کے بعد جہاں اس کو جاب (Job) ملی وہاں رہائش کی سہولیت نہ تھی جب افشاں نے شہر میں مکان تلاش کرنا شروع کیا تو اس سے پوچھا گیا۔

''آپ ماتھے پر بندی نہیں لگاتی ہیں؟''

''میں بندی نہیں لگاتی'' افشاں جواب دیتی۔

''آپ کے گلے میں منگل سوتر بھی نہیں ہے''۔

''ہمارے یہاں منگل سوتر بھی نہیں پہنا جاتا۔ ویسے میں کنواری بھی ہوں''۔

یہ سن کر افشاں سے کھرے کھرے لفظوں میں کہا گیا۔

''اب مکان ڈھونڈنے والیاں مکان ڈھونڈنے کے لیے بندی لگا کر اور منگل سوتر پہن کر نکلتی ہیں۔ مگر جب نام پوچھو تو مسلم نام بتاتی ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''افشاں'' افشاں اسے گھورتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

''افشاں'' پوچھنے والا مشکوک انداز میں دہراتا ہے پھر سوال کرتا ہے۔

''ہندو افشاں یا مسلمان افشاں''

''مسلمان'' افشاں جواب دیتی ہے۔

''سوری (Sorry) ہم مسلمان کو مکان نہیں دیتے۔ ان کو بھی نہیں دیا جو ایک بار اپنی ساڑی میں چھاتی کے اوپر پینٹل کا کمل کا پھول لگا کر آئی تھیں''۔ یکا یک وہ اپنے خیالوں سے باہر نکلا، بیٹی کے ہاتھ سے چائے لی اور اس سے کرائے کے مکان کے مسئلے پر بات کرنے لگا۔ بیٹی نے بتایا کہ اچھی لوکلیٹی میں نہیں مل رہا ہے، وہاں پہلے کے رہنے والے مسلمان بھی کروٹیں بدل رہے ہیں اس لیے اب افشاں کا ارادہ اردو اخبار پڑھنے والوں کے گندے محلوں میں مکان تلاش کرنے کا ہے۔

وقت گزر رہا تھا

نہ تو وہ

نہ اس کی بیٹی

نہ بیوی

نہ اس کے رہبر، حاکم، بزرگ اور دوست وقت کو گذرنے سے روک سکتے تھے۔ حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ مشکل سے ایک فیصدی مسلمان ہی انگریزی کا اخبار پڑھ رہا ہے، اس لیے وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا کہاں پہنچ گئی ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا ہر دن صبح ہوتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو گھر کی کنڈی کھڑکھڑائے جانے کی آواز آتی ہے، اخبار والا اخبار ڈالنے آیا ہے پھر کال بیل بجتی ہے، اس بار دودھ والا ہے۔ پھر دروازے پر پکار ہوتی ہے۔ کڑکڑاتی آواز میں قرأت کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔

''سلّو میاں''۔

پکار پر دروازہ کھولا جاتا ہے تو ایک گاڑھا اور ثقیل سا ''سلام علیکم'' فضا میں گونجتا ہے، آدھے سوتے آدھے جاگتے گھر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ سلّو جلدی جلدی وضو کرتا ہے پھر گھر کے کونے کھدرے میں مڑی تڑی رنگ شکستہ ٹوپی تلاش کی جاتی ہے جس کو سر پر

منڈھنے کے بعد منڈھنے والے کا چہرہ ہی بدل جاتا ہے۔آدھی پیشانی ٹوپی کے نیچے چھپ جاتی ہے، وہ ہونق سا مولوی کے سامنے بیٹھا ہے، سیپارہ کھول کر اور سر کو آگے پیچھے جھٹکا دے کر اور سیپارے کی سطروں پر انگلی دوڑا کر جھوم جھوم کر اسے پڑھتا ہے لیکن اتنی محنت کے بعد بھی اس کے معنی نہیں سمجھ پاتا اور وقت ہے کہ گذرتا رہتا ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں، منہ کھلا رہتا ہے، حلق آوازیں نکالنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ ہدایتیں سننے کے لیے کان کھلے رہتے ہیں اور وقت ہے کہ رینگتا رہتا ہے اور سلو کے کھلے کانوں میں مولوی اپنے دیرینہ خوف انڈیلتا رہتا ہے۔

"یاد رکھو مسلمان کے گھروں میں دیوالی کے چراغ جلیں تو ان کے دھوئیں کی بو سے رحمت کے فرشتے گھر میں نہیں آتے۔"

اگر سلو کے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ رحمت کے فرشتے کیسے ہوتے ہیں، گورے ہوتے ہیں یا کالے تو بھی وہی مولوی صاحب کی ہیبت میں ان سے پوچھ نہیں پاتا پھر ہولی کا دن آتا ہے۔ ماں سلو سے سر درد دور کرنے کی گولی محلہ کے کیمسٹ کی دوکان سے منگاتی ہے تو سلو گھر سے باہر نکلنے کو منع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے میرے بدن پر ہولی کا رنگ پڑ گیا تو بدن کا اتنا حصہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ انٹرنیشنل ہوٹل میں مینجر کی پوسٹ پر ملازم بہن کو جب اپنے بھائی کے دل میں بھرے خطروں کی خبر ہوتی ہے تو وہ آبدیدہ ہو جاتی ہے باپ کو STD کرتی ہے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد باپ سے پوچھ بیٹھتی ہے۔

"ابو کیا ہم دوسروں سے خوفزدہ رہتے رہتے اب خود سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کیا رحمت کے وہ فرشتے ابھی تک زندہ ہیں جن کا دیوالی کے چراغوں کے دھوئیں میں دم گھٹتا ہے۔ وہ بیٹی کی باتیں خاموشی سے سنتا ہے اور اس کو یہ بھی نہیں بتاتا کہ وہ روز ہی اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ کر صبح صبح کچھ لکھتا تھا لیکن وہ حیران ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے وہ کچھ سوچ نہیں پا رہا۔ اسے بار بار ایسا لگنے لگتا ہے جیسے کمرے کے

کسی کونے سے کلورین کی زہریلی گیس رِس رِس کر نکل رہی ہے جوان کے بیٹے اور بیوی کو سیریا کے مظلوموں کی طرح مار دے گی۔ اس کو عبدالکریم ٹھیکیدار یاد آرہے تھے ان کی سرخ آنکھیں اور اندر کا ابلتا ہوا وہ بے نام غصہ یاد آرہا تھا جس نے ان سے سارے الفاظ چھین کر ان کی جگہ ایک موٹی سی اور گندی سی گالی رکھ دی تھی۔ وہ بیٹی سے نہیں بتا پا رہے تھے کہ ابھی کل ہی عبدالکریم ٹھیکیدار آئے تھے۔ غصے میں آنکھیں لال کرکے کہہ رہے تھے۔

''کوئی حرامی قرآن شریف کی وہ آیت یاد نہیں دلاتا جس میں اللہ پاک اپنے بندوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ ہمارے لیے بہت آسان تھا کہ ہم تم سب کو انسانوں کے ایک ہی گروہ میں پیدا کرتے مگر ہم نے مختلف گروہوں میں یہ دیکھنے کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم میں سے کون نیکی کرنے میں سبقت لے جاتا ہے۔ ٹھیکیدار پھر تلملا کر بولے ''لیکن پروفیسر صاحب ہماری نیکی تو یہ ہے کہ اگر تم جنگل کے ٹھیکیدار ہو تو خوب لکڑیاں چراؤ۔ میں خوب لکڑیاں چراتا ہوں۔ ساگون اور صندل پر ہاتھ مارتا ہوں۔ خوب رشوتیں دیتا ہوں۔ لڑکی کو جو جہیز دوں گا اسے دیکھ کر لوگوں کی پوں پوں پھٹ جائے گی۔ یہ ہے دنیا۔ اس دنیا کی تو سالی ماں کا بھو...... اس بار عبدالکریم نے دنیا کو پہلے سے زیادہ موٹی گالی دی۔ پھر زمین پر تھوکا اور انگوچھے سے منہ پونچھ کر چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد بیٹی نے جب فون پر باپ کی خیریت پوچھی تو اس کے دل میں آیا کہ وہ افشاں سے معلوم کرے کہ کیا کلورین گیس کئی طرح کی ہوتی ہیں؟ اور کیا ریاست (State) ہی نہیں بلکہ اب تو بڑی بڑی نجی تنظیموں کے پاس کلورین کی زہر پاشی کے لیے مخصوص ہیلی کاپٹر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں پوچھنے کا اسے موقعہ نہ ملا۔ اس دن اسے ڈاک سے ایک البم ملا تھا جو پولش ایمبیسی میں کام کرنے والے ایک دوست نے اس کو بھیجا تھا، اس البم میں دوسری جنگ عظیم کے درمیان یہودیوں پر کیے گئے جرمنوں کے وحشت ناک مظالم کی تصویریں تھیں۔ ان سیکڑوں لوگوں کی تصویریں جن کو ایک ہی وقت میں برہنہ کرکے گیس چیمبروں میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ بیٹی کے فون سے

فراغت پاکر وہ البم کے موٹے اور چکنے صفحات کی ورق گردانی کرتے کرتے بوجھل سانسوں کے ساتھ سو گیا۔

صبح ہوئی تو اس کے کانوں میں مولوی بشیر الدین کی کرخت آواز سنائی دی اس کی آنکھ کھل گئی۔ مولوی صاحب سلّو کو تخت پر اپنے سامنے بٹھائے تھے۔ گرمی بہت تھی پاس ہی سلّو کی والدہ مولوی صاحب کو پنکھا جھل رہی تھی۔ بشیر الدین سلّو کو سمجھا رہے تھے "مسلمان شریعت کو بھول گئے اسی لیے مسلمانوں کے پاس نہ عزت ہے اور نہ مال۔ یہ سامان تو انھیں جنت میں ہی ملے گا بشرطیکہ مسلمان شہادت کا راستہ اختیار کریں۔

سلّو بشیر الدین کو اپنے بدن کے ہر روئیں کی آنکھ سے گھور رہا تھا، سماعت کی آخری حدوں تک سن رہا تھا اور پورے انہماک سے استاد کی ذات کو اپنے اندر قطرہ قطرہ پی رہا تھا۔ سلّو کا باپ اسے اپنے بستر سے ٹکٹکی باندھے دیکھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہلو" وہ فون پر مخاطب ہوا۔ دوسری جانب سے اس کی بیٹی افشاں کی آواز سنائی دی۔

"ڈیڈی۔ مجھے اردو اخبار پڑھنے والوں کے گندے محلے میں کرائے پر ایک فلیٹ مل گیا ہے مگر وہاں کل جوئے خانے کی گلی میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کرفیو بھی لگ گیا ہے۔

"کیوں؟" باپ نے تشویش کے ساتھ پوچھا "کیا مقتول ہندو تھا؟"

"نہیں" افشاں نے جواب دیا "قاتل اور مقتول دونوں ہی مسلمان ہیں مگر ایک شیعہ ہے اور ایک سنی۔ جلدی میں ہوں پھر بات کرونگی"۔ اس کے بعد فون کٹ گیا۔

افشاں کے فون نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا، بڑی احتیاط سے اس نے افشاں کو پالا تھا۔ بیٹی کی ذرا سی لغزش پر پہروں تاسف میں ڈوبا رہتا۔ اسے یاد آیا کہ افشاں بارھویں درجے میں پڑھ رہی تھی۔ ایک بار گوالیار کا ایک مندر دیکھنے کے لیے افشاں اس کے ساتھ تھی۔ اس موقع پر افشاں کے مرحوم دادا بھی ہم سفر

تھے۔ مندر میں ایک مورتی کو دیکھ کر افشاں نے کچھ برا سا منہ بنایا۔ اُس کے دادا نے اُسے ایسا کرتے دیکھ لیا اور کچھ فکر مند سے ہو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب اور علم الاصنام کو نظر انداز کر کے اچھا نہیں کیا۔ انڈونیشیا اور ایران کو دیکھو۔ وہاں کے مسلمان اسلام سے پہلے کی اپنی تہذیبی روایتوں پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ اچھا ہوگا اگر تم اپنی لڑکی کو اِس منحوسیت سے بچا کر رکھو''۔

شاید اس کے باپ کی ناک بہت زود حس تھی وہ کسی بھی خطرناک بو کو بہت جلد محسوس کر لیتی تھی۔ اس کے بعد سے وہ اپنے باپ کی نصیحت کو کبھی نہیں بھولا۔

افشاں کے فون نے اس کے باپ کے دل میں زبردست ہلچل پیدا کر دی تھی۔ شاید اس کا وہم ہی تھا کہ اسی وقت فضا میں دور کہیں کسی ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی اور اس کے نتھنے کسی خطرناک بو کے احساس سے پھڑ پھڑانے لگے۔ وہ ہتھیلیوں سے دونوں آنکھوں کو رگڑ کر آسمان میں اس ہیلی کاپٹر کو تلاش کرنے لگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ہیلی کاپٹر اپنی بناوٹ میں اُن جیسا تو نہیں جو کلورین گیس کی زہر پاشی کرتے ہیں اور چوہوں کی طرح ننھے ننھے بچوں کو مار دیتے ہیں۔ اس کی نظر میں افشاں ابھی بھی ننھی سی بچی ہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ رات آئی۔ رات آئی تو اپنے ساتھ ایک نیا درد لیکر آئی۔ ایک پھوڑا تھا جو اندر ہی اندر کہیں ٹپک رہا تھا۔ سلّو کے باپ کی بے چینی اب بہت بڑھ چکی تھی، بار بار دانتوں سے ہونٹوں کو چبا رہے تھے، سامنے عبدالکریم ٹھیکیدار بیٹھے تھے۔ کمرے میں منحوس اور مردار خاموشی چھائی تھی۔ کوئی بڑا طوفان آنے کو تھا۔

''ایک بار پھر سوچ لو'' ٹھیکیدار نے خاموشی توڑی۔ سلّو کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔ ''وہ کہے گی تم لڑکی کو تو خراب کر ہی چکے ہو، اب لڑکے کو تو اللہ رسول سے محروم نہ کرو پھر تم کیا جواب دو گے''۔ اُس نے دو پل عبدالکریم ٹھیکیدار کو

گھورا پھر بولا۔

"میں کیا جواب دوں گا"۔

اسی وقت یکبارگی کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ آندھی طوفان کی طرح کھلے جن کے پیچھے سلو کی ماں کان لگائے سن رہی تھی۔ تو وہ چیخی۔

"ہاں۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟ جب خاندان کی پردہ دار عورتوں نے تم سے پوچھا کہ تمہاری لڑکی چوتڑوں پر منڈھی ہوئی جینس پہن کر اور بغیر آستین کے ٹاپس کے اندر چھاتیاں اُچھال کر مردوں کو رِجھاتی ہے تو تم کو کیسا لگتا ہے۔ کیا تم نے انھیں کوئی جواب دیا تھا، ساری زندگی میری بچی کو بے دینی کے زہر میں نہلا کر تم مجھے جہنم کی آگ میں سینکتے رہے، وہ ماں کو چٹکیوں میں اُڑانے لگی۔ میں ذلتیں جھیلتی رہی اب لڑکے کو جہنمی نہ بننے دوں گی۔ جب تمہاری لاڈلی یاریاں کر کے حمل گرائے گی تو کیا پنکھے میں لٹک کر مرو گے یا تب بھی شرم نہ آئے گی"۔ یہ سن کر ٹھیکیدار کا منہ یکا یک شرم سے سرخ ہو گیا اور وہ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا۔

دوسری شام سلو کے گھر کے باہر پڑوسیوں کی بھیڑ لگی تھی، کچھ پولیس والے فوٹو گرافر کے انتظار میں بار بار گھر کے اندر باہر آجا رہے تھے۔ ٹھیکیدار عبدالکریم بھیڑ سے الگ ایک کونے میں گردن جھکائے کھڑے تھے ایک سفید پوش پڑوسی ان کے پاس گئے، دھیرے سے بولے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے، لاش مردانی ہے یا زنانی"۔ عبدالکریم کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، گھٹی آواز میں کہا۔

"نہ مردانی ہے نا زنانی۔ شاید وقت کے دباؤ میں آئے ہوئے انسانوں کی لاش ہے"۔ پھر انھوں نے گردن جھکالی اور بڑبڑائے "اس دنیا سالی کی تو ماں کی......" گردن اُٹھائی تو دونوں آنکھیں چھلچھلا پڑیں، وہ آنسوؤں سے تر چہرے کو دونوں ہتھیلیوں سے صاف کرنے لگے۔ ●●

آہستہ آہستہ

میں نے دیکھا ہے ایئر پورٹ پر۔

شاندار سوٹ، قیمتی ٹائی، چمچماتے کالے جوتے والے رعب دار چہروں کو چوڑے چکلے سینے والے اکثر لوگوں کو تیز تیز چلتے دیکھا ہے۔

ایک آدھ تو ان میں سے ایسے بھی تھے جن سے طبیعت نہیں مانی تو میں نے پوچھ بھی لیا۔

''اتنا تیز کیوں چل رہے ہیں آپ؟''

پوچھنے والوں میں ایک آدمی دلچسپ تھا، فوراً جواب دیا۔

''وقت پیسہ ہے''۔

وہ اتنی تیز چل رہا تھا کہ اس کے ساتھ چلنے میں میری سانس پھولنے لگی تھی مگر میں نے پھر بھی مکالمہ جاری رکھا۔

''کیا آپ اپنی رفتار کم نہیں کر سکتے؟''

''کیوں؟'' اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''میں تھکا جا رہا ہوں''۔ جواب میں وہ بولا۔

''تو پھر آپ اپنی رفتار کم کیجئے۔ میری رفتار Programmed ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''یعنی میرے منصوبے کے مطابق ہے''۔

میں بگڑ گیا، وہ چلا گیا، بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن بعض باتوں کی روح آئی گئی نہیں

ہو پاتی۔

ایک دن۔

وہ میرے معمول کا کوئی بھی دن ہو سکتا ہے۔

ویسے بھی ایک پورٹر کے دن اور رات کیا ہو سکتے ہیں سب ہی جانتے ہیں۔

تو بس انھیں ایک دنوں میں سے ایک دن اس شاندار ایئر پورٹ کے فرش پر وہی آدمی جس کی چال Programmed تھی فلٹ ہیٹ پہنے مجھے پھر تیز تیز چلتے دکھائی دیا۔

وہ اپنی آتما کو پوری طرح ایک طرف دھیان سے لگا کر اور بدن کے ایک ایک حصے کا زور لگا کر آگے قدم بڑھا رہا تھا، اس کی کنپٹیوں میں دانتوں کو بار بار بھینچنے سے بار بار تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اگر وہ تیز نہیں چلا تو کوئی اسے پیچھے سے دبوچ لے گا اور پھر وہ نہیں بچے گا یا پھر اس کے جیون کا سارا سکھ بس اس کے تیز چلنے پر ہی ہے۔

ایک بار ایک تیز چلنے والے نے مجھے بتایا تھا کہ وہ روز صبح ورزش کرنے جم Gym جاتا ہے اور اتنی ورزش کرتا ہے کہ پسینے سے موٹا تولیہ بھیگ جاتا ہے۔ میں نے اس سے جاننا چاہا کہ پسینہ بہانے کے لئے اسے کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے؟ وہ یہ سن کر مسکرایا اور بولا

"کیا کرو گے پوچھ کر زندگی میں پسینہ نکالنے اور سکھانے کی قیمت کا کوئی حساب نہیں ہوتا ورنہ تمہارا پسینہ اور میرا پسینہ ایک ہی قیمت کا ہوتا۔"

اس وقت مجھے اپنی جوان بیوی جمنا یاد آئی جو کھولی میں کام کرتے کرتے جب اپنا پسینہ پونچھتی تھی تو اس کی ساری کا پلو بھیگ جاتا تھا۔ اتنا سستا پسینہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔

پھر ایک گورے چٹے، شاندار ہاتھ پیروں والے اور کھچڑی بالوں والے ٹھوس جسم کے آدمی کو جب میں نے تیز تیز چلنے پر ٹوکا تو اس نے اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور لمبی سی کار میں، جس کا دروازہ کھولے کوئی کھڑا تھا بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے والا جب تک اپنی سیٹ پر بیٹھا، اس نے مجھ سے کہا۔

''خوشی آسانی سے کہاں ملتی ہے؟ تیز پھر اور تیز چلنا ہی نہیں دوڑنا بھی پڑتا ہے''
اس کے بعد اس کی گاڑی پانی کی سطح پر تیرتی کشتی کی طرح سڑک پر چلنے لگی۔ اب مجھے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا۔ میں کیوں لوگوں کے تیز چلنے کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ اب یہ سوال بار بار میرے دماغ میں اُٹھ رہا تھا۔ ایک بار دفتر کے میڈیکل کلینک میں میں نے ڈاکٹر کو بھی بتایا کہ شاید میرے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے۔ انھیں دنوں ایرپورٹ کے بک سیلر کے کاؤنٹر پر مجھے ٹائمس آف انڈیا کے اخبار کے پہلے صفحہ پر وہی آدمی دکھائی دیا جس نے کار میں بیٹھتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ خوشی حاصل کرنے کے لئے تیز چلنا ہی نہیں دوڑنا بھی پڑتا ہے۔ اس ٹھوس بدن والے گورے چٹے آدمی کو پولیس گرفتار کر کے لئے جا رہی تھی۔

ایرپورٹ پر پورٹر کا کام کرنے کی وجہ سے اکثر مسافر ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کی شکلیں جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک عورت جو گلے تک جوانی سے بھری ہوئی تھی وہ بھی ایسی جوانی سے جسے آدمی رک کر اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھے وہ عورت اس بار جو تیز تیز چلتے مجھے نظر آئی تو میں نے ہمت کر کے اُسے بتایا۔

''فلٹ ہیٹ اور سوٹ بوٹ والے ایک جنٹلمین بھی کچھ دن پہلے آپ کی رفتار سے چل کر ایرپورٹ میں گھسے تھے۔ وہ کہتے تھے میری رفتار منصوبہ بند ہے، کیا آپ کی رفتار......''

پورٹر کی یونیفارم میں دیکھ کر میں اُسے اجنبی نہیں لگا۔ مسکرا کر بولی۔

''ہاں۔ میں نے تم کو ان کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا''

''کیسے؟'' میں حیرت سے بولا۔

''میں اس کا پیچھا کر رہی تھی''۔

''تو کیا آج بھی آپ اس جنٹلمین کا پیچھا کر رہی ہیں؟''

''نہیں۔ آج وہ میرا پیچھا کر رہا ہے''۔ وہ مجھ سے پوری طرح مانوس لگ رہی تھی۔ میں گھبرا کر بولا۔

''آپ کا پیچھا کیا جا رہا ہے تو آپ جائیں''۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی مجھے کینٹین کی دیوار کے پیچھے لیکر آئی۔ پھر بولی۔

''جائیں تو کہاں جائیں۔ زندگی میں کبھی ہم جو لینا چاہتے ہیں وہ لے نہیں پاتے اور کبھی جو دینا چاہتے ہیں وہ دے نہیں پاتے''۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ فلٹ ہیٹ والا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن ان دونوں کو ہی ایک دوسرے پر یقین نہیں ہے۔ شاید تیز چلنے والوں کا دنیا سے بھروسہ اور یقین اُٹھ چکا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے پیچھے جاسوس لگا رکھے ہیں، پھر اس نے مجھے بڑی ادا سے آئس کریم کا چوٹی تک بھرا ہوا کون تھما دیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کیا کروں مگر اس نے جھٹ سے زبردستی ہی وہ کون مجھے تھما دیا میرے منہ سے نکل گیا۔

''وہ تو مالدار لگتا ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے تو کر لیجئے''۔

''نہیں تم نہیں سمجھو گے۔ بچے ماں کو ٹی وی نہیں دیکھنے دیتے انٹرنیٹ پر نہیں بیٹھنے دیتے۔ میں اپنی خوشیاں کیوں بانٹوں؟'' میں آئس کریم کا کون پکڑے رہا اُس کے سامنے کھانے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ دھیرے سے بولا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں، سب لوگ پورٹر نہیں ہوتے''۔ وہ چہک کر بولی۔

''Exactly، ہمارے گاڈ نے سب کو خوش اس لئے نہیں رکھا ہے کہ پھر دنیا سے خوشی کی تلاش ہی ختم ہو جائے گی''۔ میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ ایسا ہونے پر تو لوگ تیز تیز چلنا ہی بند کر دیں گے، بیٹھے رہیں گے یا پھر لیٹے رہیں گے لیکن وہ جلدی سے

بولی۔

"تم اس فلٹ ہیٹ والے پر یہاں نظر رکھو۔ کب آتا ہے، کس کے ساتھ آتا ہے کیا کرتا ہے۔ میں تم کو اچھی بخشش دونگی"۔ میں گھبرا کر اس کی شکل دیکھنے لگا تب تک وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور مجھے ہکا بکا چھوڑ کر چلی گئی۔

اسی وقت جلدی جلدی پسینہ نکلنے اور سوکھنے والا کام کرتے ہوئے اور ہر دم مسکرانے والی اپنی بیوی جمنا دیوی کو یاد کرتے ہوئے جسے ہنس ہنس کر اپنے پڑوسیوں سے بات کرنے کا شوق تھا۔ میری نظر ایک بوڑھی عورت پر پڑی جو قیمتی ساڑی پہنے اور سر سے پیر تک زیوروں سے لدی تھی مگر بدحواسی کی حالت میں ننگے پیر ایک طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ وہ میرے سامنے آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"مائی تو دو من سونا بدن پر لاد کر اس بڑھاپے میں اتنی تیز چل کر کہاں جا رہی ہے؟"

اس نے دیکھا کہ میں پورٹر ہوں تو دلال سمجھ کر جلدی سے بولی۔

"بیٹا میرے لڑکے کو کسٹم والوں نے اسمگلنگ کے شک میں پکڑ لیا ہے۔ سارا زیور پہن کر آئی ہوں، جو مانگیں گے دے دونگی مگر میرے بیٹے کو چھڑوا دو"۔ وہ مجھے کسٹم والوں کا دلال سمجھ رہی تھی یا پھر پورٹروں کے لئے شاید عام طور پر ایسا مشہور رہا ہوگا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

جس کھولی میں کرائے پر میں رہتا ہوں وہ مجھے بس مقدر سے ہی مل گئی ورنہ اس بھاگتے دوڑتے شہر میں بہت بھٹکنا پڑتا۔ میرے آنے سے کچھ ہی دن پہلے اس کھولی میں یوپی سے آیا ہوا ایک جوڑا رہتا تھا۔ پتا لگا کہ بیوی کو میاں نے بدچلنی کے شک میں گلا ریت کر مار ڈالا تھا اور خود اب جیل میں بند تھا۔ رام اوتار پورٹر جو اس وقت میرا دوست بن چکا تھا اس کی کوششوں سے مجھے اس قاتل بنارسی بابو والی کھولی مل گئی۔ ایک دن

رام اوتار اچھے موڈ میں تھا۔ ٹھرے کی بوتل اور بیوی کی بنائی انڈے کی بھرجی سامنے رکھی تھی۔ بڑی سی گالی دے کر بولا۔

"کیا زمانہ آگیا ہے۔ عورت ایک مرد سے خوش نہیں رہ پاتی۔ شوہر کتنا بھی کچھ کر لے۔ وہ جھٹ سے اجنبی مرد کے آگے کپڑے اُتار دیتی ہے۔ اخباروں میں دیکھو لوگ چوتیئے سالے بیویوں کو جان سے مار دیتے ہیں۔ میں تو اپنی بیوی کو چوتڑ پر لات مار کر گھر سے نکالوں گا بھی نہیں، روز روز عورت ہی ڈھونڈتے رہو وہی دنیا بھر کا لفڑا۔ میں تو اسی چھنال سے کہونگا میری سیوا کر۔ کپڑے دھو، بھوجن بنا۔

ایک بار میری رات کی ڈیوٹی تھی۔

ایر پورٹ کی عمارت کی شیشے کی دیواروں کے اس پار میں چھماتی بارش دیکھ رہا تھا۔ میں دل میں ایک کسک لئے بار بار اپنی کھولی اور اپنی بیوی جمنا کو یاد کر رہا تھا۔ یوں تو جمنا دبلی پتلی تھی مگر کولھے بڑے خوبصورت تھے۔ وہ اپنے لمبے کالے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں سے بڑی استادی کے ساتھ کام لیتی تھی۔ اس دن کھولی میں کچھ ایسا ہوا تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس دن کھولی میں ایک نیا مہمان دکھائی دیا۔ وہ مہمان ایک جلی ہوئی بیڑی کا ٹکڑا تھا۔ اس بارش کو دیکھتے ہوئے بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ پی ہوئی اس بیڑی کا ٹکڑا وہاں کیسے آیا۔ میں سگریٹ، بیڑی اور دارو کچھ نہیں پیتا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے کمرے کے فرش پر بچھی چٹائی کے کونے سے جھانکتا بیڑی کا وہ ٹکڑا آجاتا۔ میں نے کوشش کی کہ اس کے خیال کو جھٹک دوں مگر وہ ٹکڑا میرے دماغ کے پردے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں مجھے رام اوتار کی باتیں بھی یاد آرہی تھیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ہاتھ اس جیب کو ٹٹولنے لگتا تھا جس میں میں نے ایک شکاری چاقو رکھا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک بار مجھے ایسا لگا جیسے میری کھولی کے فرش پر اپنی بیوی کے گلے سے اُچھلتے ہوئے خون کی دھار بہہ کر دہلیز کے نیچے سے نکلتی، پتلی سی نالی سے

گزرتی ہوئی باہر جارہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تب میں اندر سے کانپ بھی رہا تھا۔

میں جمنا کو کتنا چاہتا تھا یہ تو کبھی سوچا بھی نہیں مگر بڑے گھر کے مردوں کی طرح صبح شام اسے یاد بھی نہیں دلاتا تھا کہ I Love You۔

آگے چل کر میری خاموشی کے بیچ کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے کمرے کے فرش کے کسی نہ کسی کونے میں پی ہوئی بیڑی کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیتا، میں اُسے سنبھال کر رکھتا۔ اپنے اندر اُٹھتے جوالا مکھی کو دباتا اور جب کئی ٹکڑے میرے پاس جمع ہو گئے تو میں نے ان کو فرش پر ایک جگہ ڈھیر کر کے اُن پر اگر بتی جلائی اور جمنا کو سامنے بٹھا کر کہا۔

''آج مجھے بھگوان سے ایک پرارتھنا کرنا ہے۔ تم بھی سنو کہ میں بھگوان سے کیا مانگ رہا ہوں''۔ یہ کہہ کر میں نے پرارتھنا شروع کر دی۔

''ہے بھگوان میں تو سگریٹ بیڑی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ پھر میرے گھر میں یہ بیڑیاں کہاں سے آتی ہیں، دیکھ بھگوان اس بیڑی والے سے میرا پیچھا چھڑا دے، نہیں تو تیری قسم میں اس کا گلا کاٹ دونگا''۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے آنسو نکل آئیں گے میں رونے لگا اور دیر تک کرتے سے اپنے آنسو پونچھتا رہا۔ جمنا یہ دیکھ کر ایک لمبے سناٹے میں آگئی۔ رات میں بھی اس نے کسی وقت مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

میں ہمیشہ سے کافی سویرے اُٹھتا تھا لیکن جب میں اُٹھا تو جمنا گھر میں نہ تھی اور کھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ جب وہ دن بھر نہ آئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اس کے قصبے سے گزرنے والی بس سے اپنے گھر نکل گئی ہے۔ میں نے طے کرلیا کہ میں جمنا کے گھر والوں سے اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرونگا۔ یہ بھی نہ کہوں گا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

میں تیار ہو کر ایرپورٹ پہنچا تو لمبی سفید داڑھی والے بابا مجھے نظر آئے جو دمشق سے آیا کرتے تھے، ایرپورٹ کے افسر لوگ بتاتے تھے کہ ان کی بیٹی سفارت خانے میں کام

کرتی ہے، وہ نیچے دیکھ دیکھ کر سنبھال کر فرش پر پیر رکھ رہے تھے جیسے چیونٹی کچل جانے کا ڈر ہو۔

اندر ایک کونے میں وہ تھکے تھکے سے ایک بینچ پر بیٹھ گئے اور معمولی سامان سے لدے تھیلے کو اپنی بغل میں بینچ پر رکھ لیا۔ مجھے لگا کہ انھیں پانی کی ضرورت ہے۔ رعب دار روپ سوروپ مجھے ان کی طرف کھینچتا تھا۔ میں لپک کر پیپر گلاس میں ٹھنڈا پانی لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ واقعی پیاسے تھے، انھوں نے اسی وقت سارا پانی پی لیا۔ مسکرا کر پوچھا۔

''تم کون ہو''

''میں ایک دکھی ہوں''

میں فرش پر بیٹھ کر بابا کے پیر دبانے لگا تو بابا بولے۔

''جانور خوش رہنے کے لئے جیتا ہے اور انسان بامعنی زندگی جینے کے لئے جیتا ہے''۔

ان کی فلائٹ کی کال ہو رہی تھی اور وہ دھیرے دھیرے قدموں سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے سمجھا تھا کہ بڈھا مجھے پلٹ کر دیکھے گا بھی نہیں لیکن کچھ دور چل کر وہ رکا، پلٹ کر دیکھا پھر اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''تم پورٹر ہو، سامان ڈھوتے ہو۔ انسانوں کو بھی ڈھو کر دیکھو، اس طرح کہ انھیں تمہاری لت پڑ جائے''۔ مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ مگر ایک سوال دل میں کلبلا رہا تھا تو پوچھ لیا۔

''آپ تیز چلنا پسند نہیں کرتے یا چل نہیں پاتے؟'' وہ مجھے تھکی تھکی نظروں سے ایک پل دیکھتا رہا پھر بولا۔

''بیٹا۔ صرف اپنا بوجھ کندھے پر رکھ کر سب ہی تیز چل لیتے ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ اپنے

راستے ہو لیا پھر اس کے بعد اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

اکیلی کوٹھری میں رات ہوئی تو مجھے جمنا کی یاد آئی۔ یہ سب کیا ہوا اور کیوں ہوا میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ تیز آواز میں بھی کبھی نہیں بولا۔ لگاتار چار دن گزر گئے۔ جمنا کے گھر سے کوئی خبر نہیں آئی۔ لگ بھگ آٹھ دن نکل گئے۔ میرے اندر اب ایک انجان سا ڈر سر اٹھانے لگا۔ مجھے یہ خیال غلط لگنے لگا کہ جمنا گھر گئی ہوگی۔ تو پھر کہاں گئی؟ یہ سوچ کر ساری رات میں کروٹیں بدلتا رہا پھر خیال آیا کہ جمنا کے گھر والے بھی بڑے ضدی اور شان والے ہیں۔ روک لیا ہوگا۔ لیکن جب صبح ہوئی اور میں نے کھولی کا دروازہ کھولا تو دیکھا جمنا دروازے کی دہلیز پر بیٹھی اپنے گھٹنوں پر ٹھڈی رکھے چپکے چپکے رو رہی ہے۔ میں دو پل چپ چاپ دروازے کے دونوں پٹ کھولے بت بنا کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر الٹے پیروں اندر واپس آگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں بولوں تو کیا بولوں اور کروں تو کیا کروں۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا ویسا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میں کچھ بھی بولے بغیر صبح کے کاموں میں لگ گیا۔ جب بھی کنکھیوں سے دیکھا جمنا کو اسی طرح دہلیز پر بیٹھا ہوا پایا۔ میرا دل تیز تیز چل رہا تھا اسی الجھن میں میں نے ناشتے کے لئے میٹھی کی کھچڑی بنائی۔ جمنا کی طرف دیکھے بغیر اکیلے ہی کھائی۔ وہ گھڑی میرے لیے سب سے مشکل تھی جب میں نے ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار ہو کر کھولی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا۔ دروازے میں لگانے والا تالا کنڈے میں لٹک رہا تھا۔ سوچا اندر جا کر کنجی لے آؤں اور کھولی میں تالا لگا دوں مگر میرے کانوں میں کوئی جانی پہچانی سی تھکی تھکی آواز آئی۔

"دھیرے چلو۔ دھیرے دھیرے چلو"۔ میں گھر کھلا چھوڑ کر اور دہلیز پر بیٹھی جمنا پر نظر ڈالے بغیر ایئر پورٹ چلا آیا۔

ڈیوٹی ختم ہوئی تو ایئر پورٹ کی عمارت سے دیر تک باہر نہیں نکلا۔ نکلا تو ایسے

راستوں پر چلا جو گھما پھرا کر گھر جاتے تھے۔ گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گھر کے دروازے کے دونوں پٹ پاٹوپاٹ کھلے ہیں۔ دہلیز پار کی تو باہری کمرے میں کوئی نہیں تھا، رسوئی کی کوٹھری میں کھٹر پٹر ہو رہی تھی۔ کمرے کا مورنگ کا فرش پونچھے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا تھا۔ میں یونیفارم اُتار کر پلنگ پر آیا ہی تھا کہ پاس رکھے اسٹول پر چائے کے ڈونگے اور کھارے ملے مُرمروں کی کٹوری رکھی جا چکی تھی۔ میں نے چائے تو پی لی مگر کچھ کھایا نہیں اور سبزی لینے پڑوس کے بازار چلا گیا۔ واپس آیا تو جمنا دہلیز پر صاف ستھرے کپڑوں میں کنگھی چوٹی کیے کھڑی تھی۔ میں ٹھٹکا مگر تب تک جمنا سبزی کی تھیلی میرے ہاتھ سے لے چکی تھی۔ مجھے پہلی بار لگا کہ اتنی سی دیر میں میرے گھر کی چھت و دیوار میں یہاں تک کہ میرا بستر سب میں کہیں نہ کہیں اور کچھ نہ کچھ بدلاؤ آ چکا تھا۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ جمنا جلدی جلدی فرش پر چٹائی بچھا رہی تھی۔ رسوئی جا رہی تھی، کھانے سے سجی تھالی رکھ رہی تھی، پیتل کا وہ لوٹا جس کا رنگ دھندلا پڑ گیا تھا پانی سے بھرا ہوا چمچما رہا تھا میں سوچ رہا تھا۔ ایک پل میں آدمی کتنی ڈھیر ساری چیزیں کھو دیتا ہے۔ کھانے کی تھالی چٹائی پر رکھ کر جب جمنا واپس جانے کے لئے مڑی تو میں نے اپنی نوکیلی اور گرم لوہے کی طرح جلتی ہوئی نظریں اس کی پیٹھ پر گڑا دیں۔ میں اوپر اوپر سے شانت ضرور تھا مگر اندر اندر ایک لاوا سا کھول رہا تھا۔ میں اپنی لمبی چپ کو ویسے ہی تھامے رہا اور اسی چپی کو سادھے ہوئے جمنا کو پوچھے بغیر کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر چھت کو تکنے لگا۔ جمنا نے باہر کے دروازے کے دونوں پٹ بھیڑ دیئے اور خود میرے پلنگ کے پاس فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اسی وقت کانوں میں ایک بوڑھی سی آواز سرسرائی۔

”آہستہ۔ آہستہ“۔

دو پل بعد جمنا نے خاموشی توڑی اور یکا یک بھڑک کر بولی۔

"مجھے پتا ہے تمہیں سگریٹ بیڑی پینے والے اچھے نہیں لگتے۔ تم نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی کہ وہ بیڑی پینے والے سے تمہارا پیچھا چھڑا دے ورنہ تم اس کا گلا کاٹ دو گے، بولو کی تھی نا تم نے یہ پرارتھنا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ میری خاموشی پر شاید وہ چڑ گئی اور اس بار اور بھی غصے کے ساتھ اس کی آواز نکلی۔

"ایک بات سن لو!"

"تم گلا کاٹو یا کچھ بھی کرو۔ میں مرد چھوڑ سکتی ہوں، بیڑی پینا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اپنے بھیا سے بھی یہی کہہ کر آئی ہوں"۔

جمنا کی بات سن کر میں بستر پر جس پہلو لیٹا تھا اسی پہلو لیٹا رہا۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سویرا ہوا تو اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

جمنا کو جگائے بغیر باہر جانے کے لئے تیار ہوا اور باہر کے دروازے کے دونوں پٹ آہستہ سے بند کر کے ایئر پورٹ چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اب تک سامان ہی ڈھوتا رہا ہوں، انسان کو کس طرح آہستہ آہستہ ڈھویا جاتا ہے یہ بھی تو سیکھنا ہے۔

●●

باب سوئم

کتابوں پر موتنے والی

شام ہوئی تو عبداللہ کے دروازے پر کالے رنگ کی ایک گاڑی آکر رُکی اس میں سے گورے بدن پر کالی ساڑھی پہنے اپنے کانوں کے جھمکوں کی طرح لہراتے لچکیلے بدن والی ایک جوان لڑکی اُتری جس کو اس نے پہچان لیا۔ وہ زلیخا تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بزرگ افسانہ نگار جو اب رنڈیوں کے سامنے کوڑے تو کھا سکتی تھیں مگر ادبی انعامات کے نام پر ایک دوشالے کی بھی روادار نہ تھیں۔ زلیخا ان کی نازوں پالی اکلوتی لڑکی تھی جو اُن دنوں ہندی پتر کارتا کے میدان میں خاصی تیز دوڑ رہی تھی اور شاعری گا کر پہلی صف میں بیٹھے منتریوں پر مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتی تھیں اور طبیعت مچل دینے والے عشق و عاشقی والے شعر سناتی تھی۔

زلیخا گاڑی سے اُتر کر سیدھی عبداللہ کے گھر میں داخل ہوئی، جو پیشے سے ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ گھر کے کس حصے میں وہ ٹی وی پر بی بی سی کی خبریں سنتے ہوئے ملیں گے۔

"عبداللہ چچا" کمرے کے دروازے کی دہلیز پر پیر رکھتے ہی زلیخا نے زور سے آواز لگائی۔ وہ عبداللہ ملک کو عبداللہ چچا کہہ کر بچپن سے ہی پکارتی تھی۔

مگر عبداللہ چچا اس وقت ٹی وی پر خبریں نہیں سن رہے تھے۔ سلگتا ہوا نقشیں حقہ پاس ہی مسکین بنا سر جھکائے کھڑا تھا، گود میں اردو کا ایک ضخیم پاکستانی رسالہ کھلا تھا۔

زلیخا نے ان کی گود میں رکھے رسالے کو اپنی طرف کھینچ کر بند کیا اور پھر پہلو میں رکھی پرانی دھرانی میز پر پٹک کر اُنھیں خبر دی۔

آپ کو کچھ خبر ہے عبداللہ ملک کو ان کی مجموعی خدمات پر ریاست کی اکادمی نے 5لاکھ کا مولانا محمد حسین آزاد اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

عبداللہ نے مسکراتے ہوئے زلیخا کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالی۔ زلیخا اپنی ننھی سی کتیا کو اولاد کی طرح گود میں لیے پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ کتیا کی آنکھوں میں قدرت نے بڑا پرکشش کاجل لگایا تھا۔

اسی وقت عبداللہ کے موبائل پر گھنٹی بجی، زلیخا کی دی ہوئی خبر کی تصدیق اکیڈمی کے وائس چیئرمین نے فون پر کر دی تھی۔

میں دیکھ رہی ہوں یہ اعزاز پچھلے تین سالوں سے لگاتار افسانہ نگاروں کو مل رہا ہے۔

عبداللہ ملک کو جیسے لقوا مار گیا تھا، وہ سناٹے کی کیفیت میں کرسی پر بت کی طرح ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

زلیخا نے بہت سی باتیں کیں۔ عبداللہ چچا کو بتایا کہ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے اکیڈمیوں کی انعامی کمیٹیوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، وہ شاعروں کو ذلیل اور مشاعرہ پڑھنے والے مقبول ترین شعراء کو ذلیل تر سمجھتے ہیں۔ وہ اس صدی کو فکشن کی صدی مانتے ہیں۔

پھر اس نے عبداللہ کو یاد دلایا کہ جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تب سے عبداللہ کے افسانے اور ان کی تحریریں پڑھ رہی ہے۔ پھر زلیخا نے اپنے منہ بولے عبداللہ چچا سے آنکھیں چار کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”میں آپ کو 5 لاکھ کے انعام پر مبارکباد دینے نہیں آئی ہوں بلکہ اس موضوع پر کھل کر آپ سے کسی وقت بات کرنا چاہتی ہوں۔
عبداللہ ملک انعام پانے کی خبر پر ابھی بھی سناٹے میں تھے۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے یکا یک زلیخا اپنی جگہ پر سے یہ کہتے ہوئے اُٹھی۔

میری ماں نے دس سال میں چوبیس ناولیں لکھیں جب کہ لوگ ایک ناول لکھنے پر تین تین سال لگا دیتے ہیں، اُس غریب کو کسی نے انعام و اکرام کے لیے نہیں پوچھا۔ عبداللہ چچا وہ یکبارگی تلملا کر بولی ''اب آپ دیکھئے گا کہ میں کیا کرتی ہوں۔ وہ وقت دور نہیں ہے۔ اس کے بعد زلیخا کچھ سوچتے ہوئے اپنی کتیا کا سر سہلانے لگی۔ عبداللہ نے اندر کی آنکھوں سے پہلی بار زلیخا کی کتیا جولی کو ٹٹولا۔ اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ جولی اور زلیخا کی آنکھوں میں کتنی زبردست مشابہت تھی۔ وہی بے نیازی وہی کھلنڈراپن۔ لاعلمی کے صدقے میں عطا کی ہوئی طمانیت جولی کی آنکھوں میں بھی چمک رہی تھی جیسی زلیخا کی آنکھوں میں تھی، عبداللہ کو لگا کہ زلیخا کی گود میں بیٹھی جولی متواتر اسے گھورے جا رہی تھی ایک بار تو عبداللہ کو ایسا لگا جیسے زلیخا کی طرح جولی کی آنکھیں بھی اس سے کہہ رہی ہوں۔

بیوقوف یہ بھی نہیں جانتے کہ یہاں ادب تحریر کرنا کتنی بڑی حماقت ہے، پھر تمہیں پڑھنے والے کتنے ہیں، ان میں کتنی غربت ہے، جہالت ہے اور انھیں ناانصافی میں پینے والی کیسی کیسی چکیاں ہیں، تم نے دیکھا نہیں اعلیٰ تہذیب صرف چند لوگوں کو اچھے کتے پالنے کا موقع دیتی ہے۔ پھر عبداللہ کو ایسا لگا جیسے زلیخا کی کتیا اُسے دیکھ کر مسکرائی، بالکل اُس طرح جیسے زلیخا مسکراتی ہے پھر ویسے ہی لہجے اور اسی انداز سے اِٹھلا کر بولی جیسے زلیخا بولتی ہے۔

عبداللہ چچا کتیا ہونا کتنا اچھا ہے۔

تہذیب و تمدن، خوش حالی، آزادی اور انصاف۔ کتیا ہونے سے ہر لعنت سے چھٹکارا مل جاتا ہے چچا۔

عبداللہ میاں ادب کی چاہ نہ تو اس بات کی ضمانت ہے کہ انسان کے ضمیر کو ایک عظیم پیکر مل جائے گا اور نہ اس کی زندگی ظالموں کے قدموں تلے کچلنے سے چھٹکارا پائے گی۔

عبداللہ آنکھیں گڑو کر کتیا کو دیکھے جارہا تھا اور وہ عبداللہ کو ویسے ہی دیدہ دلیری اور بے باکی سے دیکھ رہی تھی جیسے زلیخا دیکھا کرتی تھی۔ جب زلیخا اپنی کتیا کے ساتھ چلی گئی تو عبداللہ کو احساس ہوا کہ 5 لاکھ کے اعزاز کی خبر سے مارے خوشی کے ان کے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ چھوٹی موٹی رقموں کے کئی اعزازات پا چکے تھے مگر پانچ لاکھ کے انعام کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ انعام کی ساری رقم بیوی کے نام ایف ڈی کریں گے۔

5 لاکھ کے انعام کی خبر کئی اعتبار سے ان کے لیے عجیب خبر تھی، دوستوں کی مبارکباد کے فون تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتے، جنھوں نے ان کی نیند غائب کردی تھی، ان کا دماغ خون کی تیز گردش سے پک رہا تھا اور بار بار پوچھ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ تم اتنے بڑے ادیب کیسے ہو سکتے ہو؟

تمہاری مجموعی خدمات سات آٹھ افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہیں، کیا یہ انعام تمہاری بیش قیمت خدمات کو دیکھ کر دیا گیا ہے یا تمہاری غربت، تنگ دستی اور بڑھاپے پر چند مہربان دوستوں نے ترس کھا کر دیا ہے۔

عبداللہ اداس تھا۔ ایک بات کا قلق اُسے ہو رہا تھا، جس رسالے کے مدیر نے کئی برس اسے نمایاں جگہ دے کر اس کے افسانے چھاپے تھے اور خود بھی ایک عمدہ فکشن نگار تھا اور جس کو موٹی موٹی رقموں کے بڑے بڑے قومی اعزازات بھی بجا طور پر مل چکے تھے، اسے مبارکباد دینے والوں میں آخر اس مدیر کا فون کیوں نہیں آیا۔ یا پھر اس مدیر کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اس کے مقابلے میں چہ پدی چہ پدی کا شوربہ کو اتنی موٹی رقم کا انعام دے دیا گیا۔

یکا یک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف زلیخا تھی وہ بغیر کسی تمہید کے کہہ رہی تھی۔

کتابوں میں بیان کیے جانے والے آدمیوں سے مشاعرہ گاہ کی صفوں میں پالتی مارے بیٹھے ہوئے عام زندگی گزارنے والے آدمی مختلف ہی نہیں بہت مختلف ہوتے ہیں۔کتابوں میں انھیں بڑے سوچ بچار کے بعد جس طرح نقلی بنایا جاتا ہے اس عمل کا نام فن ہے، ہم مشاعروں کے شاعر ہلکا پھلکا کلام کہہ کر اور اسے گا کر عام آدمی کے مردہ احساس کو زندہ کرتے ہیں۔مسقط میں مشاعرہ پڑھنے جانے سے پہلے آپ سے یہ پوچھنے آؤں گی کہ انسان کا احساس اگر مردہ ہو جائے تو علم اور دانشوری کس کام کی رہ جاتی ہے۔میرا آپ سے جلدی ملنا ضروری ہے کیونکہ میں مسقط سے نیوجرسی چلی جاؤں گی تو بیس پچیس دن میں واپس ہوگی۔زندگی بھر کاغذ کالے کرنے کے عیوض اعزاز کی جو رقم آپ کو قبر میں پیر لٹکاتے وقت ملی ہے اتنی تو ہم بیرونی ممالک میں پڑھے گئے دو مشاعروں سے کما لیتے ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا عبداللہ ملک کے تصور میں اعزازات تفویض کیے جانے والے جلسے کا منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ادیبوں اور شاعروں سے بھرا ہوا سجا سنورا ہال بار بار اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔اس موقعہ پر خاص خاص اعزازات پانے والے ادیبوں کی قد آدم پینٹلوں پر بڑی بڑی تصویریں لگی ہوں گی۔کیونکہ اس نے سب سے بڑا اعزاز پایا ہے اس لیے وہ ڈائس پر سب سے نمایاں نشست پر بٹھایا جائے گا، ہار پھول گلدستے آٹو گراف لینے والی طالبات کی ریل پیل مبارک سلامت کی آوازیں۔جب صوبے کا چیف منسٹر مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر شال ڈال رہا ہوگا اور ساتھ ساتھ مائک پر اس کے کوائف پڑھے جا رہے ہوں گے اور فوٹو گرافروں کا ہجوم فلیش گن چمکا رہا ہوگا تو ہال تالیوں سے گونج رہا ہوگا مگر بہت سے جل ککڑے منافق بغل میں چھری اور منہ پر رام رام کے ساتھ اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے خاک ہو چکے ہوں گے۔اردو ادب کی دنیا کتنی مختصر اور محدود ہوگئی ہے اس میں مینڈکوں کی طرح سانس لے رہے جل ککڑے اپنے کو

چھپا نہیں پاتے۔ عبداللہ ملک نے طے کرلیا کہ کچھ بھی ہو وہ انعام لینے جلسے میں ضرور جائے گا۔ دل کھول کر دیا جانے والا اتنا بڑا اعزاز ہر ادارہ کہاں دیتا ہے۔ شال، گلدستہ، ناریل، بروشر، مومنٹو اور انعام کا لفافہ۔ اچھا خاصہ سامان ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ اب کپکپانے لگے ہیں، اتنا سامان سنبھالنے کے لیے وہ کسی کو اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن جب وہ تنہائی میں رات کو اپنے بستر پر لیٹا تو اندھیرے میں مسہری کے پاس کچھ آہٹ سی ہوئی، اس نے دیکھنے کی کوشش کی، آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر ایسا لگا جیسے کسی نے دھیمے سے آواز دی۔

عبداللہ ملک!

کون؟ عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔

میں تمہارے دل کے اندھیرے کونے میں کبھی کبھی لہراتا ہوا ایک موہوم سا سایہ ہوں یا پھر پریشان کر دینے والا برق رفتار احساس ہوں۔ میں تم سے اکیلے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا شوق اکیلے میں بات کرنا ہے۔

''پوچھو''! جواب ملا۔

کیا جو لوگ انعام و اکرام پاتے ہیں، اخباروں میں تصویروں کے ساتھ جن کی خبریں چھپتی ہیں جو انعام پانے کے بعد جلسے میں اپنے لکھنے کا تحریر شدہ جواز پڑھ کر سامعین کو فخر سے سناتے ہیں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ بٹورتے ہیں کیا وہ انعام وہ اعزاز وہ تقریب وہ سپاس نامہ، وہ تہنیتی کلمات انھیں اور ان کے نام کو ادب میں لافانی بنا دینے کے پرمٹ کا کام کرتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا انعام اور اعزاز وجود میں لایا جاسکا ہے جو تمہارے سینے پر فوجی تمغے کی طرح ٹانک دیا جائے تو تم لافانی شاعر بن جاؤ؟ اس کے علاوہ ایک اور سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

عبداللہ ملک! وہ سوال بھی اکیلے میں پوچھنے والا ہے۔

''پوچھو'' عبداللہ کپکپاتی آواز میں بولا۔

''دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو گے نا؟''

''ہاں!''

''کیا تم کو یقین ہے کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگلے پچاس برس بھی زندہ رہے گا؟''

عبداللہ ملک سوال کو غور سے سنتا ہے، لمبی سی ایک سانس لیتا ہے، چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا ہے، دل کے اندھیرے سے ایک سسکی سی نکلتی ہے، عبداللہ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، گلا رندھ جاتا ہے، باہر آنگن کی دیوار پر کسی جنگلی بلی کے رونے کی منحوس آواز آتی ہے، عبداللہ کے سینے میں ایک تڑپن سی اُٹھتی ہے، وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سختی سے سر کے نیچے رکھے تکئے میں گڑوا دیتا ہے، ہلکی سی زخمی سی سسکی لیتے ہوئے کہتا ہے۔

''میں صرف لکھتا ہوں۔ پیشین گوئیاں نہیں کرتا''۔

کمرے میں ہر طرف سناٹا ایک بار پھر سر اُٹھاتا ہے کہ دھیرے سے پھر وہ پُراسرار آواز سنائی دیتی ہے۔

''میز پر پڑا وہ بروشر اُٹھاؤ جس میں تمہارے صوبے کے سالانہ تقسیم انعامات کے موقعے پر اردو ادب کے انعامات پانے والوں کے کوائف اور ان کی تصویریں چھپی ہیں۔ عبداللہ کانپتے ہاتھوں سے فولڈر اُٹھاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے سرہانے رکھا ٹیبل لیمپ خود بخود روشن ہو جاتا ہے۔ پُراسرار آواز آتی ہے۔

''انعامات پانے والوں کے کوائف غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں ایسے انعام پانے والے ادیب اور شاعر کتنے ہیں جن کی تعلیم کا خانہ خالی ہے''۔

''چار نام ایسے ہیں جن کی تعلیم کے خانے میں کچھ نہیں لکھا ہے'' عبداللہ جواب دیتا ہے۔

سوال ہوتا ہے" کیا یہ بھی پتا نہیں کہ وہ پانچواں بھی پاس ہیں یا نہیں؟"

"نہیں" عبداللہ جواب دیتا ہے، کمرے کی روشنی غائب ہو جاتی ہے، اندھیرا اور سناٹا گہرا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بڑی کوفت بھری خاموشی رہتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی پُراسرار آواز خاموشی کو توڑتی ہے۔

"اب ایک کام کرو۔ میں روشنی جلاتا ہوں غور سے دیکھ کر بتاؤ ایسے کتنے ادیب و شاعر ہیں جن کی تحریر کردہ کتابوں، مجموعوں یا تخلیقات کی تفصیل کا ان کے شائع شدہ کوائف میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

عبداللہ پوری توجہ سے فولڈر کے صفحات کچھ دیر الٹ پلٹ کر چھان بین کرتا ہے پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے۔

"تین نام ایسے ہیں جن کی ایک بھی تخلیق، تالیف، تدوین یا ترجمے تک کا بھی ذکر نہیں۔ جگہ بالکل خالی پڑی ہے۔

سوال ہوتا ہے" یعنی انعامی کمیٹی نے ان لوگوں کو کس بناء پر اور ان کی کونسی لائق ستائش خدمات پر اعزاز کا مستحق سمجھا ہے، یہ پتا نہیں لگایا جا سکتا نا؟

"نہیں"۔ یکا یک کمرے میں پھر اندھیرا ہو گیا، عبداللہ کو محسوس ہوا کہ اتنی دیر میں اُس اندھیرے کے اندر نوکیلے دانت اُگ آئے ہیں اور اندھیرے میں خطرناک حد تک زخمی اور لہولہان کر دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، اور اندھیرا بڑے جارحانہ انداز میں رُک رُک کر غرّا رہا ہے اور کہہ رہا ہے" ابھی کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد مونگ پھلی کا ٹھیلہ لگانے والے جاہل لٹھ کو اعزاز دینے کے لیے پکڑ کر لاؤ گے"۔ عبداللہ کچھ خوفزدہ ہو کر تھکی تھکی آواز میں بڑبڑایا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں سونا چاہتا ہوں"

جواب آیا" سو جانا، نیند تو ایک آسیب کے مانند چڑھی بیٹھی ہے تم پر، وہ لوگ اب

کہاں رہ گئے ہیں جو دوسروں کو سلانے کے لیے خود مشکل سے چار گھنٹے بھی نہیں سو پاتے تھے۔بس میرا آخری سوال، حالانکہ مجھے امید نہیں ہے کہ تم ایمانداری سے جواب دو گے پھر بھی ایک کوشش کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں اپنی جاگی جاگی نظروں سے عبداللہ کے سوئے سوئے سے چہرے کو کچھ دیر ٹٹولتا رہا۔پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"کیا تم کو یہ بات اچھی لگے گی کہ تم اعزاز کے مستحق تو ہو لیکن وہ تم کو نہ ملے۔یا پھر یہ بات اچھی لگے گی کہ اعزاز تو تم کو مل جائے لیکن تم اُس کے مستحق نہ ہو"۔

عبداللہ اب آدھا سو رہا تھا اور آدھا جاگ رہا تھا۔اس کو اندھیرے میں پریشان کرنے والا اب مینڈک کی طرح حقیر اور بدعقل لگ رہا تھا۔عبداللہ چپ رہا اور بستر پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

"بولو جواب دو" آواز نے اسے جھنجھوڑ دیا،"تمہیں کونسی بات اچھی لگے گی، مستحق ہوتے ہوئے بھی انعام نہ ملنا یا غیر مستحق ہوتے ہوئے بھی انعام پا جانا"۔

عبداللہ نے اپنی نیند کو بھگانے کی کوشش ذرا بھی نہیں کی۔اونگھتے ہوئے سوئی سوئی سی ڈگمگاتی آواز میں بولا۔

یار کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو تم،کیسی بھی گالی دو میں ہاتھ آئی ہوئی رقم اور اعزاز واپس نہیں کروں گا"

"کیوں؟" پُراسرار آواز غرائی۔ پھر بے قابو ہو کر چیخی "کیوں نہیں واپس کرو گے؟"

عبداللہ نے تب بھی نیند پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی،اسے سینے سے چمٹائے بولا۔

"میں واپس کروں گا تو کسی اور کو مل جائے گا کسی ایسے کو بھی جس نے کبھی ایک لفظ

نہ اردو میں لکھا ہو، نہ ہندی میں۔ جب دکان لگائی ہے تو مال بیچیں گے ہی!"

یہ کہہ کر عبداللہ ملک بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ دھوئیں میں بھرے دم گھٹا دینے والے کمرے میں ایک پل بعد وہ خراٹے لے رہا تھا، اس کی بیوی البتہ فجر کی اذان کے انتظار میں آنکھیں بند کیے جاگ رہی تھی۔

عبداللہ کو بار بار خیال آتا کہ پورے بنگال، بہار، مہاراشٹر اور یوپی کے اردو سماج میں اس کو ملنے والے اعزاز کے چرچے ہو رہے ہوں گے۔ اس نے مختلف ذرائع سے پتا لگایا کہ اعزاز دیئے جانے کی خبر کہاں کہاں چھپی ہے تو پتا لگا کہ یوپی کے چند اردو اخباروں نے انعامات کے اعلان کی خبر چھاپی تھی۔ عبداللہ کو حیرت تھی کہ کسی اخبار نے بھی عبداللہ کی تصویر حاصل کر کے خبر کے ساتھ چھاپنے کی کوشش نہ کی۔ انگریزی اخباروں نے اکیڈمی کے اس اعلان کو منہ بھی نہیں لگایا اور دو سطریں بھی کسی نے نہ چھاپیں۔

وہ لوگ جو عبداللہ کے گھر مبارکباد دینے آئے تھے ان کے چہرے عبداللہ کی نظروں کے سامنے بار بار گھوم رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اندرونی خوشی کی کوئی چمک نہ تھی، آواز میں بھی جوش وخروش کے بجائے بے کیفی اور سپاٹ پن تھا۔ ایک صاحب نے مبارکباد دے کر مٹھائی کھا لینے کے بعد چلتے چلتے عبداللہ کو بتایا کہ ایک بزرگ نقاد کا کہنا ہے کہ عبداللہ کے افسانے Meaning ful Manupulations کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب اُن نقاد سے پوچھا گیا کہ وہ عبداللہ کے فن پر کچھ کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے صاف کہہ دیا۔

"عبداللہ کو چاہیئے کہ وہ اپنا ناقد خود لیکر آئیں، اس کے بعد لکھنے کا کام کریں"۔

انعامات کے سرکاری اعلانات ہوئے تقریباً ڈیڑھ مہینہ جب گزر گیا اور اعزاز دہندگان کی جانب سے تقسیم انعامات کے اس ہونے والے جلسے کی کوئی خیر وخبر نہ ملی جس کی عبداللہ کی آنکھوں میں بہت دنوں سے چکاچوندھ تھی تو اس نے ادارے کے

حکام سے رابطہ قائم کیا اور معلوم کیا کہ تقسیم انعامات کا جلسہ کب ہوگا تو وہاں سے کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔

ایک دن عبداللہ کو زلیخا کی یاد آئی۔ وہ عبداللہ سے ملے بغیر بیرونی ممالک میں مشاعرے پڑھنے چلی گئی تھی۔ جس کو مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ زلیخا چند روز پہلے ہی ہندوستان واپس آئی ہے۔ پھر خبر ملی کہ وہ صوبے کی اردو اکادمی کی وائس چیئرمین بننے والی ہے پھر ایک دن ایک اردو اخبار میں ایک بیان چھپا۔ اس نے کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے سے پہلے مجمع کو مخاطب کر کے کہا تھا" مجھے اردو کے پروفیسروں سے نفرت ہے۔ میرے شعری تجربے کو آپ آزادی سے محسوس نہیں کر پاتے کیونکہ پروفیسر اپنی تنقید کی تلوار سے پہلے ہی اسے لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ جس طرح اور جیسا وہ چاہتا ہے میں اس طرح اور ویسا لکھوں۔ میری نظمیں اور میرا کلام جو میں آپ کے سامنے پڑھتی ہوں میرے پنجرے کی Love birds ہیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم چڑیاں۔ میں انھیں پنجرے سے نکال کر آزاد کر دیتی ہوں۔ سانپوں، شکروں اور بازوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہوں۔ میں شاعری میں Thought content ڈال کر اس کو بکواس نہیں بناتی۔ آپ مجھ سے کیسی شاعری چاہتے ہیں میں وہ لکھتی ہوں۔ جو آرٹ فلسفہ بگھارتا ہے اُپدیش دیتا ہے وہ آرٹ نہیں ہے، آرٹ میرے گیتوں کی طرح یا تو محبت کرتا ہے یا نفرت"۔

ایک موقعے پر مقامی شاعروں کے جلسے میں زلیخا نے پروفیسروں کو کھری کھری سنائی۔ اس نے صاف کہا۔

"میرا بس چلے تو میں ان کو گالیاں دوں، یہ بے سر پیر کے بے معنی اور چلتاؤ قسم کے کھوکھلے سیمینار کراتے ہیں اور مشاعروں کو گالیاں دیتے ہیں، میں نے چیف منسٹر سے بے لاگ اور لپیٹ کے کہہ دیا کہ میں سیمیناروں کے بجائے مشاعرے کراؤں گی اور ہر

شاعر کو پندرہ ہزار کا معاوضہ دلواؤں گی، جب دیکھو تب بڑے انعامات نثر اور افسانہ لکھنے والے ہی لے جایا کرتے ہیں، اب نثر پر انعام پانچ سال میں ایک بار ہی ہونا چاہئے۔ باقی سال شاعروں کو ہی انعامات دیا جانا مناسب ہوگا۔

ایک دن عبداللہ کے گھر زلیخا آگئی، اس کی گود میں جولی بھی تھی۔

''یہ پھر تمہاری گود میں چڑھی ہوئی ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''محبت!''

''محبت تو تمہیں اپنے عبداللہ چچا سے بھی ہے لیکن جب سے آئی ہو تم نے خبر ہی نہیں لی ہماری''

''کیا خبر لوں؟ مجھے آپ کو انعام ملنے پر خوشی نہیں ہوئی ہے''۔

''کیوں؟''۔

''میں نہیں چاہتی کہ آپ آدمی کو ایمانداری سے سمجھنے اور پھر بیان کرنے کے خبط میں مبتلا ہوں اور بچوں کو ناداری اور بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کریں۔ ادیب بس ایک معمولی سا انسان ہوتا ہے، میں تو یہ مانتی ہوں کہ آپ کی لکھی کتابیں نہیں بلکہ زندہ رہنے کی چاہ آدمی کو بڑا بناتی ہے۔

زلیخا چپ ہوگئی، اپنی گود کی جولی کے سفید اور ملائم بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ زلیخا کے پاس ایک گاڑی تھی۔ گاڑی کی چھت پر پیلے رنگ کی ایک بتی بھی لگی تھی۔ اس نے عبداللہ کو بتایا کہ منصب ملنے کے بعد اس گاڑی کو لے کر سب سے پہلے وہ دیوی شریف میں حضرت وارث علی شاہ کے مزار پر حاضری دینے گئی تھی۔ وہاں ایک چھولداری میں اس نے رات بسر کی تھی، تب آدھی رات کو ایک ٹٹو کی پیٹھ پر بیٹھا گلے میں موٹی موٹی مالائیں ڈالے، کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے ایک لمبا تڑنگا، بڑی بڑی آنکھوں والا فقیر آیا تھا۔ زلیخا کی چھولداری کے پردے سے لگ کر بلند اور کڑک دار آواز میں پکارا

تھا۔

"زلیخا" اپنا نام سن کر چھولداری کے اندر زلیخا سہم گئی تھی۔ آس پاس درختوں کے جھنڈ تھے، اکاّ دکاّ گیس کے ہنڈوں کی روشنیاں ناکافی تھیں۔ چھولداری کے پردے سے لگ کر کھڑے ہوئے ملنگ کی آواز گونجتی ہے۔

"اے عورت سن! جو ہو چکا وہ بھی ٹھیک تھا، جو ہو رہا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ میں بھی پہلے لفظوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ رات رات بھر نہ سوتا تھا۔ سب کہتے تھے ادب فرد کے احساس کو تراشتا ہے۔ اسی تراش سے تہذیبیں سنورتی ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ جو کام پانچ سو ادیب اور شاعر کاغذ کالے کر کے برسوں نہیں کر پاتے وہی کام چٹکی بجاتے میں منہ پر کالک پوتنے والے کر ڈالتے ہیں۔ تب سے ادب کی ریاضت کا کام چھوڑ کر فقیری لے لی۔ جانتی ہے! اس اولیاء کے پاس نہ موٹر تھی نہ لال پیلی بتی لیکن دیکھ اس کا آستانہ کیسی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

زلیخا پردے سے جھانکتی ہے، کچھ ہی فاصلے پر حضرت کے باغ کے اُس پار مزار کی عمارت کا برقی چراغاں جھلملا رہا تھا۔ محفل بجنے کی آوازیں آتی ہیں۔ زلیخا دوبئی میں خریدی ہوئی سونے کی انگوٹھی جس میں قیمتی فیروزہ جڑا تھا فقیر کے کشکول میں ڈال دیتی ہے۔ عبداللہ کو یہ واقعہ سنا کر زلیخا چلی جاتی ہے۔

رات کا ایک بج جاتا ہے۔ عبداللہ کروٹیں بدلتا ہے، آنکھوں کے سامنے اُداس اور تھکی ہوئی بیوی کا چہرہ اُبھرتا ہے۔ بڑے جتن سے بیوی کتابوں کو عارضی طور پر ادھر اُدھر جگہ بنا کر ایک کے اوپر ایک کر کے جماتی جاتی ہے اور روتی جاتی ہے۔ بیوی بڑی بیٹی کو فون کر رہی ہے۔ اس کو یاد دلا رہی ہے کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے جائے گی، لڑکی جواب دیتی ہے۔

"امی میں نے ان کتابوں کی حالت دیکھی ہے، ان میں ایسی چمک دمک نہیں

ہے جو انھیں ڈرائنگ روم کی دیواروں میں سجایا جائے''۔

اس کی بیوی چھوٹی بیٹی کو فون کر رہی ہے۔

''بیٹی تمہارے باپ نے تمہارے نام جو ناول معنون کی ہے اس کی پچاس کاپیاں رکھی ہوئی ہیں، گھر میں کتابیں رکھنے کی کہیں جگہ نہیں ہے، تم نے کہا تھا کہ کچھ تم لے جاؤ گی؟'' لڑکی بمبئی سے جواب دیتی ہے۔

''ممی میرے ملنے والوں میں کوئی اردو پڑھ ہی نہیں پاتا۔ مسلمان لڑکیاں بھی مراٹھی اور ہندی پڑھتی ہیں''۔

عبداللہ بغیر پٹ کی کھلی الماریوں میں ٹھنسی ہوئی کتابوں کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے، بعض کتابوں کو ہاتھوں میں لیکر کھولتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تو ان کتابوں کو چھاپنے والے چھاپے خانے ہی بے نام ونشان ہو چکے ہیں، بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کے مصنفین نے اپنی دستخط سے عبداللہ کو تحفے میں دی تھیں اور اب خود قبر میں سو رہے تھے۔ ایک شیلف میں اسے معصوم طبیعت مقامی شاعروں کے درجنوں شعری مجموعے ملتے ہیں، جن کے لیے عبداللہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ان کا کیا کرے۔

ہر سال عبداللہ کی بیوی اُن کتابوں کو سیلن سے بچانے اور دھوپ دینے کی مشقت میں تھک کر اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسوؤں کو پونچھتی اور برسات میں ان کی حفاظت کرنے کے لیے فکر مند رہتی ہے۔

برسات آتی ہے۔ عبداللہ کی کتابوں کی شیلف میں ٹپکتی چھت سے پانی پہنچتا ہے، عبداللہ کی بیوی جانتی ہے کہ شور مچانے اور واویلا کرنے کا موسم آگیا ہے، بھگی کتابیں شیلف سے نکال کر بیٹھک کے فرش پر پٹکتی ہے۔ چیختی ہے۔ چوہا بل میں سمائے نا، دُم میں باندھے جھاڑ۔

عبداللہ حسرت سے بھگی ہوئی کتابوں کو دیکھتا ہے۔ کتابوں کو سکھانے کے لیے کمرہ

کا پنکھا کھولتا ہے، آثار الصنادید کی موٹی جلد پوری بھیگ چکی ہے، کمرے کا فرش بھیگی کتابوں سے ڈھک گیا ہے، اسی ساعت زلیخا کی سرکاری گاڑی کا ہارن بجتا ہے، بیوی کسی خیال سے خوش ہو جاتی ہے۔ زلیخا گود میں اپنی کتیا کو لیے کمرے میں داخل ہوتی ہے، کتابوں کو فرش پر بکھرا دیکھ کر برا سا منہ بنا کر فرش پر پیر رکھتی ہے۔ عبداللہ کی بیوی بات کو بھول نہ جائے اس لئے فوراً کہہ دیتی ہے۔

بیٹی جگہ ہے نہیں اور میرے میاں روز بروز کتابیں بڑھاتے چلے جا رہے ہیں، تم اپنے یہاں کی لائبریری میں یہ کتابیں رکھوا سکتی ہو کیا؟ دوسروں کا بھلا ہی ہو گا۔

زلیخا عبداللہ کی بیوی کو سمجھاتی ہے، وہاں بھی جگہ نہیں ہے، کتابیں بھوسے کی طرح ٹھنسی ہوئی ہیں، مانگے جانے پر کتاب کا مل جانا اکثر ممکن نہیں ہوتا۔ یکبارگی زلیخا کی گود میں بیٹھی کتیا فرش پر چھلانگ لگاتی ہے، فرش پر پھیلی کتابوں کو سونگھتے ہوئے ڈھیر کے درمیان میں پہنچتی ہے پھر پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ جاتی ہے، زلیخا اسے دیکھ رہی ہے، عبداللہ دیکھ رہا ہے، عبداللہ کی بیوی دیکھ رہی ہے، آس پاس کی کتابیں بھی شاید دم بخود ہو کر دیکھ رہی ہیں۔ یکا یک زلیخا جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے کتیا کو گود میں اُٹھا لیتی ہے، پھر پیار سے گود میں بٹھاتی ہے پھر دلار کے ساتھ ڈھیلے ہاتھ سے کتیا کو پیٹھ پر مارتے ہوئے کہتی ہے۔

"بڑی بدتمیز ہو گئی ہے، کمبخت کتابوں پر ہی موتتی ہے۔ دفتر میں بھی یہی کر کے شرمندہ کرتی ہے نہ جانے کونسی بیماری ہے اس کو"۔

عبداللہ کچھ نہیں بولتا، اس کی آنکھیں بھی کچھ نہیں بولتیں، انھیں برسوں سے آنسو چھپانے کی مہارت ہو چکی ہے، زلیخا بتاتی ہے کہ یوم اساتذہ کے موقعے پر راج بھون کے مشاعرے میں اسے جو نظم پڑھنا ہے اس پر عبداللہ ایک نظر ڈال لیں۔ عبداللہ نظم میں کھو جاتا ہے۔ عبداللہ کی بیوی زلیخا کو بتاتی ہے کہ کل ڈاکیا 5 لاکھ کی انعامی رقم کا رجسٹرڈ لفافہ

دے گیا ہے۔ تاکہ چیک منسوخ ہونے کی معینہ مدت سے پہلے انعام یافتگان اپنے کھاتے میں جمع کر سکیں مگر تقسیم انعامات کی تقریب فی الحال اس سال شاید نہ ہو پائے۔

زلیخا چیک آنے کی خبر سے خوش ہوتی ہے۔ اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

''کہاں ہے وہ چیک مجھے دکھایئے۔ شہر میں افواہ ہے کہ انعام کی رقم عبداللہ نے بڑھا کر مشہور کی ہے، ۵ لاکھ کا کوئی انعام نہیں ہوتا''۔ عبداللہ انعامی چیک کی بات کو کسی بہانے سے ٹال دیتا ہے۔ زلیخا چلی جاتی ہے۔

رات پھر آتی ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے عبداللہ چھت کو دیکھتا ہے۔ وہاں بھی اسے زلیخا کی کتیا دکھائی دیتی ہے۔ وہ کسی کتاب پر پیشاب کر رہی ہے۔ عبداللہ اس وقت اپنے ایک پیتھالوجسٹ دوست کو فون کرتا ہے۔ پوچھتا ہے کیا وہ ایک ایسے قارورے کی جانچ کر سکتا ہے جس کی کچھ بوندیں کاغذ کے لفافے پر پڑی ہیں۔ پیتھالوجسٹ راضی ہو جاتا ہے۔

پیتھالوجسٹ کے دعوے کے مطابق اس کے پاس ایسی مشینیں بھی تھیں جو پیشاب کے ذریعے معلوم کی جانے والی عام بیماریوں کے علاوہ مریض کے کردار پر بھی روشنی ڈالتی تھیں۔ بہر حال لفافے پر پڑے جولی کی پیشاب کی جانچ کی گئی اور عبداللہ کو دو روز میں رپورٹ بھی موصول ہوگئی۔ رپورٹ پڑھی تو عبداللہ کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ وہ عجیب وغریب رپورٹ اس طرح تھی۔

نام: جولی۔

عمر: نامعلوم۔

پیشاب کا رنگ: ہلکا زرد۔

تیزابیت: شدید بھی اور معنی آفرین بھی۔ کیونکہ سب سے پہلے جو چیز ملی ہے وہ جاہ حشم کی شدید چاہ ہے۔

☆ جنونی قوم پرستوں سے دوستی کرنے، ان کے قریب رہنے اور موقعہ ملنے

پر ان سے دنیاوی فائدہ اُٹھانے کا شدید جذبہ۔

☆ یہ قارورہ اپنے حلوے مانڈے کے لیے خاموش تماشائی کی طرح قوم کو آمرانہ بدبختی کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہنا اور چپ رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ اس میں ضمیر کو طاقت دینے والے اجزاء نہیں پائے گئے۔

☆ مائکرواسکوپ سے دیکھنے پر قارورے میں نہ تو آدرشوں کے جراثیم پائے گئے اور نہ آدرشوں پر مر مٹنے کا کوئی جذبہ ہی نظر آیا۔

☆ اس قارورے میں نہ کتابوں سے حاصل کردہ علم کا گاڑھا پن ہے نہ ادب کے مطالعے سے پیدا کردہ نظم وضبط ہے اور نہ دانشورانہ ریاضت کی متانت۔ اس لیے یہ قارورہ کتابوں پر موتے گا، لال پیلی بتیوں والی گاڑیوں پر گھومے گا اور آخر میں ایک بات اور۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ دعوتوں میں چقندر کھانے والوں کے چہروں پر سیاہی پوتے کیونکہ چقندر اس کو شدید ناپسند ہے۔

عبداللہ رپورٹ کو کوئی بار پڑھتا ہے، اپنی بھویں سکیڑتا ہے۔ جھنجھلا کر پیتھالوجسٹ کو فون کرتا ہے۔ دوسری طرف سے ہلو کی آواز آتی ہے۔

''کیا تمہاری مشینوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' دوست پوچھتا ہے۔

''میں نے تم کو ایک کتیا کا قارورہ جانچنے کے لیے دیا تھا۔ تم نے مجھے یہ کس کی رپورٹ بھیج دی۔ جس میں تم کو آدرشوں پر مر مٹنے کا جذبہ نہیں مل رہا۔ تصدیق کرنے کے بعد پیتھالوجسٹ فون پر عبداللہ کو بتاتا ہے کہ رپورٹ بالکل درست ہے۔ یہ کیس پیشاب میں Infection کا ہے۔ کتیا جس کی گود میں رہتی ہے اس کا انفیکشن کتیا کے پیشاب میں آگیا ہے۔ ●●

ایک زخم خوردہ چھپکلی

مرد کے مقابلے میں لوٹن کا لہجہ زیادہ تیکھا، ناگوار اور غیر مہذب تھا۔ حالانکہ مرد جو لوٹن کا شوہر تھا اپنی چھوٹی نوکیلی آنکھوں، چوڑے دہانے اور بھاری ٹھڈی کے ساتھ اپنے حلئے کے مطابق زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔ ٹرسٹ کا کمرہ مرد نے جب دیکھنے کے لئے کھول دیا گیا تو کرائے دار نے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرہ دیکھنے والا اس علاقے میں اجنبی تھا اس لئے لوٹن اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ کسی شرم اور مروت کے بغیر اس نے کرائے دار سے معلوم کیا۔

''دارو پیتے ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' کمرہ دیکھنے والے کا جواب آیا۔ لوٹن جواب سن کر خوش ہوئی۔

''کیوں فالتو باتیں کرتی ہے؟'' چھوٹی آنکھوں والے مرد نے جو وہاں چوکیدار بھی تھا اور لوٹن کا میاں بھی عورت کو سخت لہجے میں ٹوکا۔

''تو چپ کر۔'' لوٹن نے فوراً اس کو ڈپٹ دیا۔ لوٹن کا تجربہ تھا کہ شراب پینے والا نشے میں سچ بولتا ہے اس لئے دارو پینے والے سے سچ قبول وانا مشکل نہیں ہوتا۔

دونوں میاں بیوی کمرہ دیکھنے والے اجنبی نوجوان کے ساتھ کمرے کے باہر اوبڑکھابڑ میدان میں کھڑے تھے۔ وہ سنسان سا منحوسیت برساتا ہوا عجیب سا علاقہ تھا، جس کی سب سے بڑی کشش وہ چوڑی اور پکی قومی شاہراہ تھی جو اس علاقے کے درمیان سے گزرتی تھی اور جس پر تھوڑی دیر بعد ٹرکیں اور سواریوں سے لدی بسیں وغیرہ دوڑا

کرتی تھیں۔ چند قدموں کی دوری پر ایک پنجابی ڈھابہ تھا اور اس سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا بس کا اڈہ۔ اس اڈے پر گاؤں اور دو کلومیٹر دور پر قائم کئے گئے لیپر وسی Leprosy کلینک کی سواریاں ہی یہاں زیادہ اترتی تھیں، ان میں سے بعض سواریوں کی ہاتھوں کی انگلیاں اور چہرے پر ناک کو کوڑھ کھا چکا ہوتا تھا۔ وہاں سے لیپر وسی کلینک کا راستہ ایک پگڈنڈی سے مل کر پرمیشور دیال ٹرسٹ کے اجڑے پجڑے مگر کسی حد تک صحیح سلامت چھت والے تقدیم تعمیر کے نمونے کے شکستہ دروازوں تک پہنچتا تھا۔ مشہور تھا کہ جاگیردار پرمیشور دیال کا جوان لڑکا جس پر ایک زمانے میں دیوانگی اور ہزیان کا شدید دورہ پڑتا تھا، زنجیروں کے ساتھ اسی عمارت میں قید کر کے پورے عملے کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اسی ٹرسٹ نے لپرسی اسپتال کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔

کرائے پر کمرہ لینے والے نوجوان کو جب کمرہ پسند آگیا اور وہ متعین کرایہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو گیا تو چوکیدار کی بیوی لوٹن نے اس نوجوان سے پوچھا۔

''تم چھپکلیوں سے ڈرتے تو نہیں؟''

''چھپکلیاں؟'' نوجوان نے ٹپٹا کر پوچھا ''کیوں؟''

''رہو گے تو دیکھو گے''۔ عورت مسکرا کر شرارتی انداز میں بولی۔

اسی وقت میدان کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک پولیس جیپ آکر رکی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے سپاہی نے باہر جھانک کر ہارن بجایا۔ لوٹن نے تیوری چڑھا کر جیپ کی طرف دیکھا اور ہاتھ اُٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا، پھر کمرہ لینے والے نوجوان سے سوال کیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''دلبیر''۔

''رنگ بازی نہیں چلے گی دلبیر۔'' پھر اس نے چوکیدار نما شوہر کو حکم دیا۔

اسے بتا دینا کہ میرا نام لوٹن ہے'' یہ کہہ کر وہ پولیس جیپ کی طرف چل دی، لوٹن کا

باپ بھی پرمیشور دیال ٹرسٹ میں ذمہ دار جگہ پر ملازم تھا اور مشہور تھا کہ لوٹن کے دادا کی جاگیردار سے قرابت داری بھی تھی مگر جاگیر میں اسے کچھ مل نہ سکا۔ دلبیر اس گٹھیلے بدن کی سانولی سی مضبوط ہاتھ پیروں اور ارادوں کی کچھ عجیب وغریب انداز والی منہ پھٹ سی عورت کی چال کو غور سے دیکھنے لگا جس میں دہقانی بے تکلفی اور بے فکری والی جسمانی تھرکن ایک ان دیکھا اور انجانا سا لطف دے رہی تھی۔ دلبیر نے دیکھا کہ گہرے خم کے ساتھ لوٹن کے کٹاؤدار بھرے اور کسے ہوئے کولہوں سے اٹھنے والے ایک دل پذیر سے ارتعاش کے ساتھ دل کو کھینچنے والا ایک غیر معمولی اور نظریں نہ ہٹا پانے والا دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔

....

دلبیر تیس برس کا ہو چکا تھا، جب اس نے انٹر پاس کیا تو پہلی بار جوئے کے چکر میں حوالات میں بند ہوا تھا، ٹھوکروں نے عقل دی تو کتھا واچک باپ کے ایک دوست نے اسے موٹر چلانا سکھایا اور ہنومان جی کے ایک بھگت آرٹی او نے دلبیر کو موٹر ڈرائیونگ کا لائسنس دے کر اس کا بیڑا پار لگا دیا۔ وہ عورتوں کے معاملے میں بدنیت نہیں تھا مگر اس کو لوٹن کچھ عجیب سی ضرور لگی۔ لوٹن کے چہرے پر جو مردانہ رعونت تھی اس کے پیچھے کومل سی ایک زنانی چمک بھی دلبیر کو تروتازہ نظر آئی، اس چمک میں کہیں شرم وحیا کا شائبہ بھی نہ تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ لوٹن جیسی بے سروسامان عورتوں کے ماں باپ پرانے جاگیرداروں کی بے راہ رویوں اور عیاشیوں کی نشانیاں تھے۔ دلبیر کو لوٹن کی بے رس سی آواز میں ہلکی سے پتی لگی ہوئی محسوس ہوئی، جس سے لگتا تھا کہ اس کا گلا پڑا ہوا ہے۔ زندہ اور خودنگر لہجے کے ساتھ وہ پتی لگی بیٹھی میٹھی سی آواز عجیب سے جنسی کشش کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ چوکیدار پچاس کے اوپر تھا تو لوٹن ۲۵ سے زیادہ کی نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لوٹن چوکیدار کی دوسری بیوی تھی۔

جب پولیس جیپ لوٹن کو جیپ میں بٹھا کر دھواں اڑاتی نکل گئی تو دلبیر نے چوکیدار سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی پولیس میں کام کرتی ہے؟"

"نہیں۔ دوستی ہے پولیس والوں سے۔" چوکیدار نے جواب دیا پھر اسے خیال آیا کہ اس جواب سے دلبیر کو صورت حال کا صحیح اندازہ نہ ہوگا تو وہ شیخی سے بولا۔

"شہر سے آنے والی جتنی بسیں اڈے پر رکتی ہیں، ان بسوں کے کنڈکٹروں سے بھی لوٹن کی دوستی ہے، ڈھابے کے مالک اور کرمچاری سب اس کیا دوست ہیں۔ یہی نہیں تین کلو میٹر اندر جو کھدانیں ہیں وہاں کے لوگ بھی اس کے دوست ہیں اور لیپروسی کلینک Leprosy Clinic کے ڈاکٹر، ٹیکنیشین اور مریض سب اس کے دوست ہیں۔

....

دلبیر کے ہاتھوں ضروری سامان شام تک کمرہ دھو دھلا کر جما دیا گیا تھا۔ جب تک نئی چارپائی نہ آئی چوکیدار نے ایک کھاٹ دلبیر کو فراہم کر دی تھی۔

رات کے شروع کے حصے میں بستر پر لیٹے لیٹے دلبیر نے ایک آدھ موٹر سائیکل کو اس پگڈنڈی پر جانے کی آوازیں سنیں جو پرائیویٹ این جی او کی لیپروسی کلینک کی جانب جاتی تھی، تھوڑی دیر بعد اسے لگا جیسے کھڑکی کی جھری پر کوئی باہر سے آنکھ لگا کر کمرے میں دیکھ رہا ہے۔ دلبیر نے باہر نکل کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

کمرے کے آباد ہونے کے کچھ دنوں بعد جب روشنی پر گرنے والے کیڑے مکوڑے باہر جھاڑیوں سے اندر آ کر دیوار پر رینگنے لگے تو دلبیر نے دیکھا کہ روشندان اور کھڑکی کے کونوں اور باہر کے دروازے کی چوکھٹوں سے تھوڑا سا سر اندر نکال کر چھپکلیوں نے خاموش اور راز داری کے ساتھ اور بدن کو جنبش دیئے بغیر جھانکنا شروع کر دیا، دلبیر بڑے غور سے چھپکلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کیڑوں پر حملے کے لئے اپنے حریف کی آخر کونسی

پیش قدمی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسی وقت دیوار کے ایک منھنے سے کپڑے میں کچھ حرکت ہوئی تو اسے تاکنے والی چھپکلی اپنی جگہ پر کچھ بے چین ہو گئی۔ دلبیر نے دیکھا اس چھپکلی کے پیچھے سے یکا یک ایک اور چھپکلی نکل رہی تھی۔ اس کا تھوتھن اور بڑی بڑی عجیب مقناطیسی کھنچاؤ والی گول گول آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دلبیر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصی تجربہ کار، کانٹے دار موٹی دُم والی جابر زور پشت اور دوسروں کے لئے سنسنی خیز چھپکلی رہی ہوگی۔

....

شام کو وہ کھدان پر ڈیوٹی کے لئے جانے کے واسطے تیاری کر رہا تھا کہ لوٹن آ گئی۔ دلبیر نے اسے بتایا کہ کمرے میں چھپکلیاں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ پھر اس کو مقناطیسی آنکھوں والی وہ چھپکلی یاد آئی جس نے دوسری چھپکلی کے شکار کو دلیری سے آگے بڑھ کر اپنا شکار بنا لیا تھا اور دلبیر نے اسے اپنا جوتا پھینک کر مارا تو وہ اُسے بھی مات دے کر نکل گئی تھی۔ پھر الجھن بھرے انداز میں اس نے لوٹن کو یہ بھی سمجھانا چاہا کہ اس چھپکلی کی مقناطیسی آنکھیں دیکھ کر بار بار اسے کسی اور کی آنکھیں یاد آ رہی تھیں جن آنکھوں کو اس نے کہیں دیکھا تھا۔ اسی شام لوٹن دلبیر کو پنجابی ڈھابے کے مالک سے ملوانے اپنے ساتھ ڈھابے پر لے گئی۔ دلبیر نے دیکھا کہ وہاں پر موجود بعض لوگ لوٹن کو دیکھ کر اس طرح گردن جھکا کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے جیسے وہ لوٹن کا احترام کر رہے ہوں لیکن بعض لوگوں نے لوٹن کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ لوٹن نے ڈھابے کے مالک کو ہدایت کی کہ وہ دلبیر کا مہینہ وار حساب کھول لے اور اسے کھانے پینے کو دیتا رہے۔ ڈھابے سے کمرے تک واپس آتے آتے دلبیر کو یہ احساس تو ہو گیا کہ علاقے کے لوگ لوٹن کے بارے میں شاید کوئی یقینی رائے نہیں رکھتے اور نہ لوٹن کے بارے میں کھل کر بات کرتے ہیں یہاں تک کہ جو لوگ بظاہر اس کی عزت کرتے ہیں ان کے بارے میں بھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا

کہ وہ ایسا دل سے کر رہے ہیں یا دکھاوا کر رہے ہیں۔ لوٹن کو دیکھ کر خود ڈھابے کے مالک کے دلی جذبات کا پتا لگانا دلبیر کے لئے مشکل تھا حالانکہ لوٹن کے سفارش پر وہ دلبیر کو کھانا کھلانے پر فوراً راضی ہو گیا تھا۔ اس دن دلبیر کو اندازہ ہوا کہ علاقے کے لوگوں کو لوٹن ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ ایک دہقانی ڈیل ڈول والی خاتون پولیس کانسٹیبل جو لوٹن کی دوست تھی اس کے کہے ہوئے بے شرم اور ننگے الفاظ دہرانے کا موقعہ اکثر لوٹن تلاش کرتی رہتی تھی۔ لوٹن نے باتوں باتوں میں دلبیر سے بھی کہا تھا۔

"میری پولیس والی دوست بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ مرد وہ نہیں ہوتا جس کے پاس مردوں جیسا موتنے والا سامان ہوتا ہے اور انڈوں کی ایک پوٹلی بھی۔ مرد کو تو کمر کے اوپر سے بھی مرد ہونا چاہئے، دماغ کی سوچ سے، سینے کے پھیپڑوں سے اور ان کے دم سے مرد ہونے کی بات ہی کچھ اور ہے۔" یہاں تو چاروں طرف سالے سب چھپکلی کے جنے لگتے ہیں"۔ لوٹن کے چڑھے ہوئے تیور اور اپنی طرف کھینچنے والی آنکھوں سے نکلتی ترنگیں دیکھ کر تب دلبیر دنگ رہ گیا تھا اس کے لئے لوٹن کچھ اور بھی پُر اسرار ہو گئی تھی۔

....

دلبیر خوب جانتا تھا کہ وہ اس علاقے کی غیر قانونی کھدانوں میں ڈبل مزدوری کی لالچ میں ٹرالی سے خفیہ طور پر مال ڈھونے کے لئے آیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں یہ کام تیزی اور ہوشیاری سے کیا جاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے اپنی ٹرالی اس اوبڑ کھابڑ راستے پر ڈال دینا تھی جو کچا راستہ جنگل کا حصہ پار کر کے کھدانوں کی طرف جاتا تھا، جب وہ اپنا سفر شروع کرنے کے لئے ٹرالی لیکر چلنے لگا تو لوٹن نے خاص طور پر دلبیر پر یہ بھید بھی کھولا کہ چوکیدار جیسا سیدھا سادا بے زور اور بے مصرف مرد لوٹن کا شوہر صرف اس لئے ہے کہ پچھڑے سماج میں شوہر والی عورت کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے۔ لیکن جب دلبیر کی ٹرالی بھاگتی ہوئی کافی دور نکل گئی اور اس نے پیچھے پلٹ کر سڑک کے کنارے کھڑی لوٹن کو دیکھا

تو اس کے لئے یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا کہ لوٹن عورت ہے یا مرد۔

غیر قانونی کھدانوں کا کاروبار کرنے والوں کو اپنے ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حکام اور پولیس کی دبش کا ابھی کوئی امکان نہیں ہے اس لئے کام کی تیزی کے سبب دلبیر کئی روز تک اپنے کمرے پر واپس نہ آسکا۔لیکن جب ایک شام وہ واپس آیا تو دیکھا کہ اس کے تالہ لگے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔اسے احساس ہوا کہ وہ جاتے وقت روشنی بجھانا بھول گیا تھا۔اندر داخل ہوا تو دیکھا دیواروں اور چھت پر چھوٹے چھوٹے کیڑے پھیلے ہوئے تھے اور کئی طرح کی چھپکلیاں جن کے پیٹ شکار کھا کھا کر اتنے پھول گئے تھے کہ بدن کی پھرتی ختم ہو چکی تھی، دیواروں پر ڈیرہ جمائے تھیں۔اس کے اندر آنے کی آہٹ پا کر بعض نو عمر چھپکلیوں میں حرکت ہوئی اور انھوں نے وہاں سے روانگی ڈالنے کے لئے جسم کا زاویہ بدلا۔دلبیر کو یکا یک وہ بدروح اور مقناطیسی نگاہوں والی ڈراونی سی چھپکلی یاد آئی۔دلبیر نے نظریں گھما کر اسے تلاش کرنا چاہا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔

دلبیر دراصل ایک بار پھر اس غیر معمولی ہیئت والی یا پھر غیر معمولی اندرونی طاقت رکھنے والی چھپکلی کی آنکھوں کی کبھی نہ دیکھنے میں آنے والی حقیقت پسند سفاکی کے ننگے پن کے اندر گھلی ملی ایک عجیب سی درد انگیز تڑپ کو اپنی نظروں میں ایک بار پھر بھر لینا چاہتا تھا اور چپ چاپ آنکھیں بند کر کے اور بستر پر لیٹ کر اور دماغ پر زور دے کر یہ یاد کرنا چاہتا تھا کہ زندگی کی دھڑکنوں اور اس کی جھلملاہٹوں سے لبریز وہ آنکھیں اس نے کہیں اور بھی دیکھی ہیں۔لیکن کہاں؟

....

لوٹن سے ملے ہوئے دلبیر کو کئی روز ہو گئے تھے۔اسے خیال آیا کہ شاید لوٹن ڈھابے میں مل جائے، وہ بھوکا بھی تھا۔کمرہ بند کر کے کھانا ڈھونڈنے چلا گیا۔ڈھابے میں بیٹھے لوگوں میں اس وقت کھدان کے رستے میں پڑنے والے جنگل کے ٹکڑے میں اکثر رات

کے سناٹے میں ہوتی رہنے والی رہزنی کی وارداتوں میں سے کسی تازہ لوٹ پاٹ کا چرچا چل رہا تھا۔ ڈھابے پر میکنکوں اور ڈرائیوروں وغیرہ کے علاوہ ایسے حمال ٹھیلے والے بھی مل جایا کرتے تھے جنھیں پلوریسی کلینک (Pelorecy Clinic) سے سڑے گلے جسم والے مُردے لاد کر جلانے یا دفنانے لے جایا کرتے تھے۔ ایسے بدبودار گوشت اور ہڈیوں کے غیلظ ڈھیر کو ٹھیلے پر ایک آدھ بار گھسیٹے جانے کا منظر وہ کلینک کے راستے پر چلتے چلتے دیکھ چکا تھا۔ ایسے وقت میں دلبیر کو اپنے گاؤں کی وہ کوڑھی کمہارن یاد آجایا کرتی تھی جو اپنے دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر ساری کے پلّو سے اپنے پیروں کے گلتے ناخنوں کی مکھیاں ہنکایا کرتی تھی۔

جنگل میں رہزنی کی وارداتوں کے چھڑے ہوئے قصوں سے دلبیر کو پہلی بار یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ وارداتیں تب ہی ہوتی ہیں جب وہاں کی پولیس غافل ہوتی ہے یا اس کو غافل رہنے کی ہدایت کردی جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ لوٹن پولیس والوں کے بہت منہ لگی ہوئی ہے اور کبھی کبھی انھیں اس طرح حکم دیتی ہے جیسے وردی پہننے والے اس کے غلام ہوں بلکہ بعض لوگوں کی آنکھیں یہ بھی اشاروں اشاروں میں بتارہی تھیں کہ جیسے لوٹن ان وردی والوں کے استعمال میں رہا کرتی ہے اور ان حرام کاریوں میں اس کا چوکیدار شوہر بھی برابر کا شریک ہے۔ دراصل اس دن سے دلبیر کو دل ہی دل میں لوٹن کی ٹوہ سی لگ گئی تو ایک دن لوٹن کمرے پر دارو کی بوتل لایا، لوٹن کو بوتل دکھا کر کمرے پر آنے کی مسکرا کر دعوت دی۔ لیکن لوٹن نہیں آئی۔ بعد میں لوٹن نے ایک ملاقات پر دلبیر سے تیوریاں چڑھا کر پوچھا تھا۔

"دلبیر تو میرے کو یہ بتا کہ مجھے دارو پلا کر اور اپنے ساتھ سُلا کر کونسا قلعہ فتح کرلینا چاہتا تھا۔ دلبیر لوٹن سے کچھ بولا نہیں، اندر ہی اندر جھینپ سا گیا۔

....

رات آئی تو لوٹن کی طرف سے الجھنوں میں پڑا ہوا، دلبیر ٹھیک سے سو نہیں پایا اسی وقت کشادہ نیشنل ہائی وے پر رات کے سناٹے میں کسی لاری کے بریکوں کے یکا یک چیخ پڑنے کی کرخت آواز سے دلبیر کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں چھوٹا بلب ٹمٹما رہا تھا جس کی مدھم روشنی میں دلبیر نے مقناطیسی آنکھوں والی وہی بدہیبت چھپکلی دیکھی جو تھوڑے فاصلے پر دھیرے سے جنبش کرتے ایک کیڑے پر پورے ارتکاز کے ساتھ نظریں گڑائے ہوئے تھی۔ وہ کسی قدر موٹا تازہ کوئی برساتی کیڑا تھا جس پر کوئی بھاری خول سا چڑھا ہوا تھا اور اسی خول کے اندر سے اس کے پر باہر نکل کر پھر اندر سمٹ جاتے تھے۔ اسے تاکتی ہوئی چھپکلی شاید ہر زاویئے سے اسے آنک چکی تھی۔ اب وہ اس کیڑے کی نقل و حرکت کو برابر نظروں میں رکھے تھی کہ یکا یک کیڑا کسی خطرے کی بو محسوس کر کے یک بہ یک ساکت ہو گیا۔ چھپکلی نے اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، کیڑے پر جست ماری اور دوسرے لمحے ہی وہ کیڑا چھپکلی کے جبڑوں کے بیچ آ گیا مگر وہ اتنا بڑا تھا کہ چھپکلی کے منہ میں سما نہ سکا، اس کے جسم کا کچھ حصہ چھپکلی کے جبڑوں سے باہر تھا، یہ دیکھ کر دیوار سے چپکی ایک نازک بدن چھپکلی دوسری کے جبڑوں میں پھنسے کیڑے پر لپکی لیکن مقناطیسی آنکھوں والی چھپکلی نے اسے جھکائی دے کر اپنے شکار کو چھیننے نہ دیا اور جلدی سے کیڑے کے بقیہ باہر نکلے جسم کو بھی نگل لینے کی کوشش میں جیسے ہی اپنے جبڑوں کی گرفت ڈھیلی کی کیڑے نے جو اس موقعے کی پہلے ہی سے تاک میں تھا خود کو ان جبڑوں سے آزاد کر لیا اور اپنے چوٹ کھائے پروں سے اڑنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہونے پر تھوڑا نیچے جا کر دیوار سے پھر چپک گیا۔ چھوٹی چھپکلی یہ دیکھ کر پھر لپکی لیکن بڑی اس کا تعاقب کر کے اس کے دُم کے اوپری حصے پر چوٹ مار چکی تھی۔ چھوٹی نے اس کی اس حرکت کو معاف نہیں کیا اور بڑی سے دو دو ہاتھ کرنا شروع کر دیئے، دلبیر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ چھوٹی چھپکلی کی مدد کو ایک اور خرانٹ چھپکلی دور کے کونے سے دوڑ پڑی اور بڑی

کی گردن میں کاٹ کر بھاگ نکلی، آخر کو بڑی نے گھائل اور شرمسار ہو کر کمرہ چھوڑ دیا، اس لڑائی میں چھت اور دیوار کی دوسری چھپکلیوں میں افراتفری مچ جانا فطری تھا۔

....

یہ واردات اس رات کی ہے جب دلبیر مہینہ بھر کی ڈبل ملنے والی اجرت لیکر کھدانوں سے واپس اپنے کمرے پر آرہا تھا۔ برسات کے اس زمانے میں اس علاقے میں اکثر اولے پڑتے اور درجہ حرارت ایک دم گر جاتا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ موسم کی مناسبت سے رات میں سفر کرنے والے ٹرالی ڈرائیوروں نے کمبل اور گرم کپڑے بدن پر ڈالنا شروع کر دیئے تھے۔ غیر قانون مال کی لداتی پر انھیں مہینے بھر کی اچھی اجرت مع بونس کے ملی تھی اور اس کام میں لگے اب تینوں ٹرالی ڈرائیور چھٹی کر کے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔ راستے کے خطروں کے سبب تینوں نے ایک ساتھ جنگل پار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ ان دنوں ساون کا سالانہ میلہ چل رہا تھا اس لئے راستہ لوگوں کی آوک جاوک سے خالی نہ ہوگا۔ رہزنی کا کوئی خطرہ نہ دیکھ کر دلبیر بھی واپسی کے سفر کے لئے اس گروہ میں شامل ہوگیا تھا۔ مگر رات ایک بجے جب ٹرالی والوں کا وہ گروہ جنگل کے گھنے حصے میں جہاں ایک پرانا نالہ تھا پہنچا تو دیکھا سڑک کے بیچوں بیچ ایک موٹا تازہ پیڑ راستہ روکے پڑا تھا۔ ابھی وہ لوگ اپنی گاڑیوں کے بریک لگا ہی رہے تھے کہ نالے کی جانب سے دو لوگ اندھیرے سے نکل کر دو ٹرالیوں پر چڑھ دوڑے، ان کے ہاتھوں میں دیسی پستول تھے۔ سب سے پیچھے دلبیر کی ٹرالی تھی، دلبیر رکا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک گھڑسوار دلبیر پر ٹارچ ڈالتا ہوا مع گھوڑے کے اس کے سر پر آگیا۔ گھڑسوار کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ پستول والے مردوں نے جلدی جلدی بڑی مشاقی سے ٹرالی کے ان ٹھکانوں کی تلاشی لی جہاں پیسہ چھپایا جا سکتا تھا۔ پہلے تو انھوں نے موٹی موٹی رقمیں اپنے قبضے میں کیں، جو مخبری کے عین مطابق تھیں پھر ان کی نظریں سامانوں پر

پڑیں۔ دلبیر سرخ رنگ کا نیا نویلا کمبل اوڑھے ہوئے تھا، جب اس کے سر سے وہ کمبل کھینچا جانے لگا تو دلبیر نے مزاحمت کی۔ گھڑسوار یہ دیکھ کر گھوڑے کو ایڑ دیتے ہوئے پاس آیا اور ایک لات دلبیر کی پیٹھ پر جماتے ہوئے کچھ بڑبڑایا۔ دلبیر نے کمبل چھوڑ کر اپنی کمر پکڑلی۔ پھر کچھ فاصلے پر ایک غیر مانوس سی سیٹی کی آواز فضا میں اُبھری تو رہزنوں نے گھڑسوار کے اشارے پر آگے کا کام چھوڑ دیا اور تینوں نالے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ دلبیر کی جیب تو خالی کر لی گئی تھی مگر رقم رکھنے کے چور ٹھکانے تک پہنچنے اور تلاشی لینے سے پہلے ہی کسی خطرے کی آگاہی کے سبب لٹیروں کو اس جگہ سے بھاگنا پڑا تھا۔ واردات کی جگہ سے پولیس کا تھانہ کم سے کم دو کوس پر تھا، وہاں پہنچنے اور ضابطہ کی کاروائی کرتے کرتے دو گھنٹے لگ سکتے تھے اور تب تک مجرمین دس گاؤں پار کر کے آرام کر رہے ہوتے تھے۔

....

اس واردات کے بعد دلبیر کے سامنے ایسے حالات پیدا ہونے لگے کہ اسے اپنا آب و دانہ اس علاقے سے اُٹھتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ کئی دنوں بعد جب وہ اپنے کمرے پر واپس آیا تو اس کو اپنے گاؤں سے آیا ایک سندیسہ ملا۔ محلے کا کمہار اپنی عورت کو علاج کے لئے Leprocy Clinic میں لانا چاہتا تھا، اس نے دلبیر سے درخواست کی تھی کہ کلینک کے بارے میں ساری معلومات وہ کمہار کو پہنچا دے۔

دلبیر نے رات سے کچھ نہ کھایا تھا وہ ڈھابے پر ناشتہ کرنے چلا گیا۔ وہاں اسے ڈھابے کے مالک نے بند لفظوں میں خبر دی کہ کسی معاملے میں تھانے کا نیا داروغہ بڑی گہری تشویش کر رہا ہے، جمال بار بار تھانے بلائے جا چکے ہیں، ایک بار لوٹن سے بھی وہاں دو گھنٹے پوچھ تاچھ ہوئی ہے۔

....

ایک دن کچھ دیر کے لئے دلبیر کی لوٹن سے ملاقات ہوئی، لوٹن کچھ ٹوٹی سی اور تھکی

تھکی سی نظر آرہی تھی۔ دلبیر نے اس کا حال چال لینا چاہا تو وہ ٹال گئی۔ لوٹن کی آنکھوں کی وہ مقناطیسیت کہیں کھوگئی تھی۔ وہ دل میں ایک الجھن لئے کمرے پر واپس آیا تو دروازے کی چوکھٹ کے ایک کونے میں مقناطیسی آنکھوں والی اس بد ہیبت چھپکلی کو دبکا ہوا دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ چھپکلی نے آہٹ پا کر بھی کوئی نقل و حرکت نہیں کی۔ دلبیر نے غور سے دیکھا تو چھپکلی کے نچلے جبڑے اور اگلے پیر کے درمیان ایک زخم نظر آیا۔ اس کی نظر ان چیونٹیوں پر بھی پڑی جو زمین سے کمرے کی دیوار پر چڑھ کر زخمی چھپکلی کے رخ پر ایک قطار میں چلتی جا رہی تھیں۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ چیونٹیوں سے بچنے کے لئے زخمی چھپکلی چوکھٹ کو پار کر کے کمرے کے اندر آگئی جہاں دیوار پر کچھ نہ تھا لیکن تھوڑی دیر بعد قطار بنائے چینٹیاں وہاں بھی پہنچ کر چھپکلی کو پریشان کرنے لگیں۔ دلبیر نے چھپکلی کی آنکھوں میں ایسی بیکسی اور عاجزی دیکھی کہ اُسے خیال آیا کہ اس نے ان آنکھوں کو کہیں اور بھی دیکھا ہے، وہ بھی ابھی ابھی بس تھوڑی دیر پہلے۔ اسی وقت لبیر کو یاد آیا کہ اسے وہاں سے کافی دور ایک اجڑی بچڑی عمارت تک ابھی جانا ہے جس پر اکھڑے ہوئے گندے پینٹ کے ساتھ Leprocy Clinic لکھا ہے۔ دلبیر نے اس عمارت کو صرف باہر سے ہی دیکھا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ جگہ تعفن، خون اور پیپ سے بھری ایسی دوزخ سے بھی بدتر جگہ ہے، جہاں صحت مند دنیا کے انسان کے لئے ایک لمحے کو بھی قدم رکھنا سب سے بڑی سزا ہوتی ہے۔ وہ ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے وہاں پہنچ تو گیا لیکن سب سے پہلے جس پر وہاں اس کی نظر پڑی اور جسے دیکھ کر وہ گنگ رہ گیا وہ لوٹن تھی۔

لوٹن بدآمدے کی ایک ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے ایک پرانے لکڑی کے تخت پر جس کے ایک پائے کو اینٹیں رکھ کر سنبھالا گیا تھا ایک جذامی بچی کے مرہم پٹی کر رہی تھی، بچی کا مرض سے مسخ ہوتا چہرہ دیکھ کر دلبیر نے اپنا منہ پھیر لیا۔ بڑی مشکل سے دلبیر نے لوٹن کو وہاں آنے کا مقصد بتایا تو اسے پتا چلا کہ ڈاکٹر چھٹی پر ہے۔ دو نرسیں بھی بیمار پڑی ہوئی

ہیں، پچھلے تین روز سے لوٹن بھی کلینک سے باہر نہیں نکل پائی ہے، کلینک میں دوائیں وغیرہ ختم ہوگئی ہیں، وہ نیند اور بھوک دونوں سے پریشان ہے۔ پھر اس نے دلبیر سے پوچھا۔

''کیا تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

''ہاں جیب میں پچاس ساٹھ روپیے پڑے ہیں''۔ لوٹن نے اسے ہدایت کی کہ وہ باہر آم کے باغ کی منڈیر پر درخت سے ٹیکے ہوئے آموں کے ڈھیر بیچنے والے بچوں سے ایک کلو آم لے آئے۔ دلبیر ہٹپٹا کر بولا۔

''تم آم کھاؤ گی۔ وہ بھی یہاں؟'' یہ سن کر لوٹن اداسی سے مسکرائی اور اس بچی کی طرف جو لوٹن کے سینے سے پیٹھ ٹکائے چہرے پر دوا لگوا رہی تھی اشارہ کر کے بولی۔

''چوسنے والے آموں کا رس پلاؤں گی۔ یہ کچھ کھا نہیں پاتی۔ کوڑھ کے کیڑوں نے اس کے مسوڑھے کھانا شروع کر دیئے ہیں''۔ پھر ٹھنڈی سانس لیکر بولی۔

''میں نے اسے گود لیا ہے''۔

اس دن وہاں دلبیر کو معلوم ہوا کہ لوٹن نے باقاعدہ تین مہینے تک خاموشی کے ساتھ اس کلینک میں جذامی مریضوں کی مرہم پٹی اور دوائیں وغیرہ دینے کا کام سیکھا ہے۔ دلبر کو پہلی بار احساس ہوا کہ لوٹن اپنی ظاہری عمر سے کہیں زیادہ بڑی تھی۔ دلبیر آم لے کر آیا تو لوٹن نے لال دوا سے آموں کو دھو کر اور انگلیوں سے ان کے رس کو پگھلا کر آم کو آٹھ نو سال کی بچی کے منہ سے لگا کر کھلایا۔ بچی کے زخمی سے دہانے کو مشکل سے آم چوستے دیکھ کر دلبیر کو متلی ہونے لگی۔ دلبیر حیرت میں ڈوبا لوٹن کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یکا یک اس کو لگا کہ اُن آنکھوں کا درد بے بسی اور عاجزی وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ لیکن کہاں دیکھا ہے وہ یہ یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ دلبیر جب اس عمارت سے باہر آیا تو پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔

دوسرے دن کلینک کے ڈاکٹر سے ملنے کی امید میں جب دلبیر ہمت کر کے کلینک پہنچا تو ادھیڑ عمر کے سیدھے سادے ڈاکٹر سے، جو مٹی کے کلھڑ میں گڑ کی چائے پی رہا تھا دلبیر کی ملاقات ہوئی۔ وہ کلینک دراصل چند سر پھرے خدا ترسوں کا گھر پھونک تماشہ دیکھنے والا شوق تھا جسے وہ لوگ کسی این جی او کے مدد سے چلا رہے تھے۔ عمارت ٹرسٹ کی تھی اور کچھ امداد بھی ٹرسٹ سے ملی تھی۔ ساری معلومات دینے کے بعد ڈاکٹر نے دلبیر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے گاؤں کی مریضہ کو ضرور بھجوائے۔

ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد دلبیر کی آنکھیں لوٹن کو تلاش کرنے لگیں۔ لوٹن اس عمارت کے جس نیم تاریک حصے میں ملی وہاں دھوپ کا گزر نہ تھا۔ زمین پر ڈیڑھ فٹ اونچا مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا اس چبوترے پر ایک دری پڑی تھی جس پر ایک بوڑھا مریض کمبل اوڑھے لیٹا تھا اور لوٹن اس کے پیروں کی انگلیوں کے غائب ناخنوں کی جگہ کے گوشت کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ دلبیر لوٹن کے پاس آ کر رُک گیا اس وقت دلبیر کو لوٹن کی آنکھوں میں آسانی سے پہچان لی جانے والی ملائمیت نظر آئی۔ ان آنکھوں میں دلبیر کو ناگوار حالات کے جبر کو صبر و شکر کے ساتھ سہنے کی رضامندی سے خود کو تونگر محسوس کرنے کا اطمینان بخش جذبہ موجیں مارتا دکھائی دیا۔ وہ سوچتا رہا یہی کیفیت اس نے کسی اور آنکھوں میں بھی دیکھی ہے۔ کیا اس زخمی چھپکلی کی آنکھوں میں تو نہیں جسے چیونٹیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ دراصل دلبیر بہت اُداس تھا، وہ پچھلے ایک دن سے خود کو لوٹن کے آگے بہت چھوٹا اور ناکارہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ لوٹن کو بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ وہاں سے جانا چاہتا ہے۔ وہ چبوترے پر لیٹے بوڑھے مریض کے بدن پر پڑے کمبل پر یہ سوچ کر ہاتھ پھیرنے لگا کہ ایسا ہی کمبل راہزنوں نے اس کے سر پر سے اتار لیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے کمبل کے ایک کونے پر موبل آئل کا کالا دھبہ لگا تھا جو لاکھ چھٹانے کے بعد بھی نہیں چھوٹا تھا۔ وہ کمبل کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک آوارہ کتا اندر آ گیا جسے دیکھ کر لوٹن

چلائی۔

''مار سالے کو'' دلبیر کتے کو دوڑاتا ہوا باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد جب دلبیر کتے کو بھگا کر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی تھیلی میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں، وہ گڈیاں دلبیر نے لوٹن کو تھما دیں۔

''یہ کیا ہے؟'' لوٹن نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''لٹیروں کو میری ٹرالی کی تلاشی کا سمے نہیں ملا تو یہ پیسے لٹنے سے بچ گئے۔ اپنی لڑکی کے علاج پر خرچ کر دینا'' یہ کہہ کر وہ زمین پر نظریں گاڑے رہا اور لوٹن سے ایک بار بھی نظریں ملائے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ تب لوٹن نے پہلی بار اپنے دل سے سوال کیا۔

''یہ مرد مجھے کیا سمجھتا ہے''۔

....

دلبیر کمرے پر آ کر اپنا سامان سمٹنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ زخمی چھپکلی وہاں سے کہیں گئی نہیں تھی، وہ پہلے سے زیادہ مضمحل ہو گئی تھی اور چیونٹیوں کی تعداد پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ دلبیر اپنا ٹرنک لیکر وہاں سے نکلنے کو ہی تھا کہ لوٹن آ گئی۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی دلبیر سے پوچھ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''گھاگھرا ندی پر ریت ڈھونے کا کام کرونگا''۔ دلبیر لوٹن کو دو پل دیکھتا رہا پھر بولا۔

''پولیس والے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا لوٹن لوگوں کو چھپکلی کا جنا کہہ کر گالی دیتی ہے۔

''کیا؟'' لوٹن چونک کر بولی تو دلبیر نے وضاحت کی۔

''پولیس کو پتا لگا ہے کہ لوٹ پاٹ میں کسی گھڑسوار لٹیرے نے مسافر کے کہنا نہ

ماننے پر اس کی پیٹھ پر لات ماری تھی اور حرامی، چھپکلی کا جنا کہہ کر گالی دی تھی ۔ ان لفظوں کو لے کر پولیس تفتیش کر رہی ہے"۔ یہ سن کر لوٹن تلملا کر رہ گئی ۔ اتنے میں دلبیر کی نظر اس زخمی چھپکلی پر پڑی جسے چینٹیوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ وہی کانٹے دار موٹی دُم والی جابر، زور پشت اور سنسنی خیز چھپکلی تھی جس کی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں ۔ دلبیر کی نظر لوٹن کی آنکھوں پر پڑی تو وہ جیسے چونک پڑا ۔ وہی بے کسی وہی عاجزی جو سامنے دیوار کے کونے میں چپکی چھپکلی کی آنکھوں میں تھی اسے لوٹن کی آنکھوں میں بھی نظر آئی ۔ وہ شاید دلبیر سے کہہ نہیں پا رہی تھی کہ دلبیر نے اسے تیس ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں دے کر لہولہان کر دیا ہے ۔ اس درد سے اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں ۔ لوٹن کے چہرے پر بھیانک سناٹا اور آنکھوں میں اداسی دیکھ کر دلبیر سے نہ رہا گیا۔ دھیرے سے بولا۔

"چھپکلی زخمی ہو جائے تو چینٹیاں لگ جاتی ہیں"۔ لوٹن چپ رہی لیکن پھر کچھ خیال آیا تو ایکا ایک دلبیر کو مشکوک نظروں سے گھورنے لگی۔

"مجھے کیا سمجھتا ہے یہ؟" لوٹن نے سوچا "کبھی اس نے کچھ نہ بتایا۔ آخر کیا ہے اس کے دل میں میرے لئے"۔ یہ سوچ کر بجلیاں سی کوند گئیں لوٹن کی آنکھوں میں ۔ آخر کو وہ سیدھے دلبیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟" لوٹن کے اس سوال میں ایک بے قرار دل کا درد اور خود کی شناخت کی ایک معصوم خواہش بھی شامل تھی، جس کو دلبیر نے خوب محسوس کر لیا، وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ لوٹن وہ عورت ہے جو ایک ویرانے میں بھوکی پیاسی رہ کر کوڑھیوں کی بے لوث خدمت بھی کرتی ہے ۔ دلبیر کو اپنا کتھا واچک باپ یاد آ گیا۔ اس درمیان لوٹن نے دلبیر سے پھر اپنا سوال دھرایا۔

"بولو ۔ میرے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟"

دلبیر کیا سوچتا۔ کلینک میں جس مریض کو لال کمبل اوڑھے اس نے دیکھا تھا اس

کمبل کے کونے پر پڑے کالے دھبے کو دیکھ کر اس پر بجلی سی گر پڑی تھی۔ پھر اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مہینے بھر کی کمائی لوٹن کے حوالے کردے۔ مگر وہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو لوٹن کو بتائی جاتی اس لئے دلبیر جواب میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''تمہارے بارے میں کیا سوچوں؟ میرا اکتھا واچک باپ کہتا تھا کہ ہم سب جب تک انسان ہیں وہی کریں گے جو انسان کرتے آئے ہیں۔''

لوٹن پہلے تو دلبیر کو دو پل آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی، کیونکہ اسے یقین نہ تھا کہ وہ اتنا معصوم سا جواب دے گا۔ اندر سے ٹوٹی ہوئی لوٹن کے دل میں آیا کہ وہ دلبیر کے سینے پر سر رکھ کر کچھ دیر رولے لیکن دلبیر کچھ زیادہ ہی دور کھڑا گردن جھکائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

●●

اندھیر

سورج ڈوبنے کو تھا کہ ٹرین نے اپنا معصوم سفر شروع کر دیا جو آگے چل کر ایک ہنگامے میں تبدیل ہو گیا۔ بہت لوگ سارے ڈبوں میں بھرے ہوئے تھے، کوئی میلا چل رہا تھا وہ جلدی آگیا تھا اس لیے اپنی اوپر کی برتھ پر لیٹ گیا تھا، جو مسافر تازے آئے تھے وہ اپنا سامان وغیرہ جمانے میں لگے تھے۔

اُس نے دو نوجوان لڑکوں کو دیکھا وہ اس کے برابر والی اوپر کی برتھ پر پالتی مارے بیٹھے کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا لیکن اُس کے کان لڑکوں کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

''مہاتما بدھ ہندو فلاسفی کے خلاف تھے''۔ایک لڑکا بولا تو دوسرے نے لیکچر دے ڈالا۔ بولا''بدھ کہتے تھے کہ میں انتظار میں لگاتار بھوکا پیاسا رہ سکتا ہوں''۔سوال یہ ہے کہ اب کونسی چیز ایسی رہ گئی ہے جس کے لیے انتظار کیا جائے، بھوکا پیاسا رہا جائے، ایک رات میں سب کروڑ پتی ہو جانا چاہتے ہیں۔بدھ Irraivenl ہو چکے ہیں''۔پھر اس نے اپنے ساتھی کو گھورا اور بولا۔

دیکھو رتن تم بھارت ماتا بھارت ماتا کی رٹ لگاتے ہو، کیا اس کے لیے تم ایک دن بھی بھوکے رہ سکتے ہو۔رتن نے یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ جواب دیا۔

''ارے بھوکا رہنا تو کیا ہزاروں نے اس کے لیے سر تک کٹوا دیئے ہیں''۔

دونوں باتوں میں الجھتے چلے گئے۔پڑوس کی اوپری برتھ پر لیٹا فربہ آدمی ان کی باتیں سنتا رہا، اسے حیرت تھی کہ ایثار اور قربانی صبر اور تحمل کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک

لاحاصل اور بے معنی ورزش بن کر رہ گئے ہیں۔فربہ آدمی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بحث کرتے ہوئے لڑکوں کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گیا مگر کان کھلے رکھے۔

''رتن۔''ساتھی نے رتن کو پھر مخاطب کیا اور پوچھا۔

''یہ بتاؤ کہ میں کیوں بہت ایماندار بنتا ہوں''۔

''یہ تو تم ہی جانو''

''ہاں میں جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو۔میں اس لیے ایماندار ہوں کہ مجھے بے ایمانی کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔اس لیے مجبور ہو کر ایمانداری کرتا رہتا ہوں اور ایمانداری کا تمغہ سینے پر سجا کر چھاتی پھلائے پھلائے گھومتا ہوں۔

دوسری برتھ پر لڑکوں کی طرف پیٹھ کر کے لیٹے ہوئے فربہ آدمی کو یہ سن کر غصہ آیا، وہ اُٹھ کر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔

''Shutup''وہ تلملا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے۔

بئیں طرف کی کھڑکی کی نچلی برتھ پر بیچ میں بریف کیس رکھے تین لوگ تاش کا جوا کھیل رہے تھے۔بریف کیس کی چھت پر ریزگاری اور نوٹ جمع ہو گئے تھے۔گاڑی دھیمی ہونے لگی، شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا کہ اتنے میں آر پی ایف کے دو جوان کندھوں پر رائفل لٹکائے، برتھوں کے اوپر اور نیچے جھانکتے ہوئے جواریوں کی برتھ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ایک سپاہی انھیں گھورتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔

''جوا چل رہا ہے''ان میں سے ایک نے فوراً جواب دیا۔

حوالدار صاحب رات ہونے کو ہے، جایئے تھوڑا آرام کر لیجئے''دوسرا سپاہی جو آرام سے ہتھیلی پر انگوٹھا رگڑ کر سرتی بنا رہا تھا آنکھیں نچا کر سمجھانے لگا کہ آرام ان کی قسمت میں نہیں ہے، کیونکہ کسی کمپارٹمنٹ کے کسی سوٹ کیس میں حشیش ہو سکتی ہے، کسی ڈبے میں دیسی بم ہو سکتا ہے، کل اسی گاڑی میں بھگا کر ممبئی لے جانے والی سولہ برس کی لڑکی ملی تھی، ڈبے کے لیٹرن میں تازہ تازہ بچہ جننے والی زچہ کو بھی ہمیں سنبھالنا پڑتا ہے، آپ کو کیا بتائیں،

ابھی ابھی وائرلیس سے خبر مل سکتی ہے کہ کسی بڑے لیڈر کو گولی ماردی گئی ہے، قاتل اسی ٹرین میں سفر کررہا ہے۔ اتنے میں دوسرے سپاہی نے آگے بڑھ کر بریف کیس کی چھت پر پڑی ہوئی رقم کو مٹھی میں سمیٹ کر جیب میں رکھا اور جواریوں کو ڈانٹتے ہوئے بولا ''اُٹھواور چلو ہمارے ساتھ''۔ گاڑی اب رُک گئی تھی۔ ان تینوں میں سے ایک نے کھڑے ہوکر یکا یک ایک زوردار تھپڑ پیسے اُٹھانے والے سپاہی کے جڑدیا۔ سپاہی کو شاک سالگا۔ آنکھیں پھاڑے بھونچکا وہ تھپڑ مارنے والے کو دیکھنے لگا۔ اس کا ساتھی غصے سے چلایا۔

''چار راتوں سے جاگ کر ہم ڈبل ڈیوٹی کررہے ہیں۔ جوتے سے، جوتے سے مار''۔ اتنے میں مار کھانے والے سپاہی نے تھپڑ مارنے والے کے بڑے بڑے بال مٹھی میں دبائے اور دونوں اُسے گھسیٹتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر لے گئے۔ جو ناروا حرکت ہوئی تھی اس سے متاثر ہوکر باقی دونوں جواریوں کو آس پاس کے مسافر ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت جس کا خوف کے مارے چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا پھر بڑبڑائی ''بہت برا ہوا پھر تاش کھیلنے والے دونوں مسافروں کو جو کچھ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے صلاح دی۔

''تم دونوں کہیں چھپ جاؤ۔ کسی دوسرے ڈبے میں لیٹرین میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرلو''

دونوں نے عورت کو مسکرا کر دیکھا۔

''ارے مائی تم ڈرو نہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں''۔

یہ کہہ کر وہ ڈبوں کے اندر ہی اندر پھاندتے پھلوندتے نظروں سے غائب ہوگئے۔ رتن اور اس کے ساتھی پورے تماشے کو دیکھتے رہے۔ انھیں عورت کے فکرمند ہوجانے پر کچھ عجیب سالگا۔ پھر انھوں نے اس کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

''سپاہی ان لڑکوں کو ڈھونڈ نکالیں گے، وہ انھیں مار مار کر لولا لنگڑا کردیں گے''۔ اس نے اپنے چہرے پر پسینہ پونچھا، رتن سے نہیں رہا گیا وہ ادھیڑ عورت کو ڈھارس

بندھاتے ہوئے بولا۔

"ماتاجی آپ پریشان نہ ہوں"۔

"کیسے پریشان نہ ہوں، میں بھی تو ایک ماں ہوں" اس کی بات سن کر رتن کے ساتھی کو شرارت سوجھی۔ بولا۔

"آپ ماں ہیں، اچھی بات ہے مگر آج کل مائیں بھی بدل گئی ہیں"۔ یہ سن کر ایک صاحب جو اوپری برتھ پر ٹنگے ہوئے تھے زور سے ہنسے اور نیچے اُتر کر عورت سے بولے۔

"ماتاجی اب پرانے زمانے کی مائیں تو کہانیاں بن چکی ہیں"

"آپ کون ہیں؟" عورت نے ان سے پوچھا۔

"میں اخبار میں رپورٹر ہوں، پھر اس نے سمجھایا کہ جب وہ اخبار میں یہ چھاپتا ہے کہ ایک ماں نے اپنی دو بیٹیوں کو زہر دے دیا تو خود اس کی ماں کو اس خبر پر یقین نہیں آتا، وہ جب یہ خبر لکھتا ہے کہ ماں نے اپنی جوان لڑکی بیچ دی تو اس کی ماں کو یقین نہیں آتا۔

رتن کا دبلا پتلا ساتھی جس کے گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے لیکن آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی، پترکار کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا، بڑی نرمی سے عورت سے بولا۔

"ماتاجی ایک میری ماں بھی تھی"۔

تھی۔ اب نہیں ہے۔

کئی برس ہوئے کسی کے ساتھ چلی گئی۔

میں چار سال کا تھا۔ میری ماں مجھے چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے دن بھر کے لیے چلی جاتی تھ۔ میں کمرے کے اندھیرے کو، سناٹے کو اور تنہائی کو ہی اپنی ماں سمجھ کر دروازے کی دہلیز کے پاس سر رکھ کر روتے روتے سو جاتا تھا۔ جب ماں آتی دروازہ کھولتی، مجھے جگاتی، گالوں پر میری خشک آنسوؤں کے دھبے صاف کرتی، کئی برس اکیلے پن کی ویرانیوں میں بتائے۔ بڑا ہوا تو اپنے آس پاس کی دنیا میں مجھے کسی سے کوئی غرض

نہیں تھی، میں بس اپنے لیے جی رہا تھا۔ کیونکہ پیچھے بھی سناٹا تھا اور آگے بھی۔

''تم کیا کرتے ہو بیٹا۔ کیا پڑھتے ہو؟''

''پڑھ چکا''۔ وہ مسکرا کر بولا ''نوکری سارے پڑھے لکھوں کو کہاں ملتی ہے؟ کبھی کبھی کرائے پر نعرے لگانے کے لیے بلا لیا جاتا ہوں''۔

یکبارگی کمپارٹمنٹ کے مسافروں کی توجہ باہر کی طرف چلی گئی۔ پلیٹ فارم پر غیر معمولی بھاگ دوڑ ہو رہی تھی، کچھ فاصلے پر پلیٹ فارم کی ایک جانب سے شوروغل کی آوازیں آرہی تھیں۔ ٹرین کو رُکے ہوئے کچھ زیادہ ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس درمیان اگلے سفر پر چلنے کے لیے وہ دو بار سیٹی بھی دے چکی تھی۔ ڈبے کے دروازے پر کھڑے مسافروں نے خبر دی کہ گاڑی سے بہت سے لڑکے اُتر کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک بھیڑ کی نعرے بازی کی آوازیں سنائی دیں۔

''پولیس کی تاناشاہی نہیں چلے گی۔ بھارت ماتا کی جے''۔

نعرے سن کر عورت اُٹھ کر پھر بیٹھ گئی۔ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جا رہا تھا، اوپر لیٹا فربہ آدمی بے چین عورت کو غور سے دیکھنے لگا، طباقی چہرہ، غلافی آنکھیں، میدہ جیسی سفید جلد، منہ میں دانتوں کی چمکیلی بتیسی، اس کی بے چینی دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی گہری پھانس سی اس عورت کے کلیجے میں گڑ رہی تھی۔ وہ بڑبڑائی ''انھیں روکو نہیں تو کوئی انرتھ ہو جائے گا''۔ اس کی بات کسی نے نہیں سنی، البتہ اوپر لیٹے اس فربہ آدمی نے ایسی آواز میں جس کو وہ خود بھی نہیں سن سکا اس عورت کو بڑی تعظیم سے مخاطب کیا، پتا نہیں اس نے کونسے لفظ استعمال کئے یا صرف اشاروں میں ہی دل میں بس اپنے آپ سے ہی مخاطب کیا۔ اس کا ایک ایک جملہ تو بتانا مشکل ہے لیکن اس کی بھیگی آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو۔ تیری جیسی میری بھی ماں ہے۔ اس ماں نے بھی ایسے ہی کہا تھا۔ روکو انھیں۔ روکو۔

یہ سوچ کر پکارا تھا کہ آس پس کے لوگ اس کی مدد کو آجائیں گے اور اس کے

جوان بچے کو بچالیں گے۔

کوئی باہر نہ نکلا۔

اوپر بالکنی میں چھپ کر جھانکتے رہے۔

بہت دنوں بعد ایسا کوئی تماشہ ہوا تھا۔

چاروں طرف سے ڈھول پیٹ کر، نعرے لگا کر شکار کو ہر طرف سے عاجز اور بے بس کر کے، جھاڑیوں سے باہر نکلنے کے لیے مجبور کرنا پھر گھیر کر کلہاڑیوں اور بلموں سے مارنا تھا۔

شاید تیرا کوئی لاڈلا ایسے ہی مارا گیا ہوگا۔

شاید کسی دوسرے ڈبے میں بھی کوئی اور بڑھیا بھی بے چین ہو۔

ہاتھ جوڑ کر سب سے کہہ رہی ہو۔ گولی چلے گی!

انھیں روکو!۔ انھیں روکو!!

اس لیے اے مائی اپنی ریشمی رضائی سر سے اوڑھ کر سو جا۔ یہاں بہت کچھ ایسا ہوتا رہے گا جسے رکوانا بوڑھی غمزہ اور ایک پل میں سب کچھ کھو بیٹھنے والی اُداس ماؤں کے بس میں نہیں ہوتا۔

باہر کے نعروں کو سن کر رتن کے جسم کی زبان یہ بتا رہی تھی جیسے وہ کمپارٹمنٹ سے باہر کود کر بھیڑ میں شامل ہونے کے لیے بالکل تیار ہو چکا ہے۔ رتن کے ساتھی نے اس کے ارادے کو بھانپ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر انتباہ کیا۔

"سوچ لو۔ انٹرویو دینے نکلے ہو تم"۔

"چائے لے آؤں" یہ کہہ کر رتن ڈبے سے پلیٹ فارم پر پھاندا۔ ٹی اسٹال کے پاس پہنچ کر اس نے پولیس والوں کو ریلوے پولیس چوکی کی طرف بھاگتے دیکھا جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور لڑکوں کی بھیڑ چائے کے خالی کلہڑ پتھروں کی طرح اُچھال رہے تھے۔ ایک بار تو رتن کے جی میں آئی کہ وہ اس بھیڑ میں شامل ہو کر ہنگامہ کرنے والوں کا

حوصلہ بڑھائے مگر اسی وقت اس کے ساتھی نے پیچھے سے آکر اس کا کرتا کھینچ کر اسے اپنی طرف موڑا اور جلدی جلدی ڈھکیلتا ہوا ڈبے کے اندر لے آیا۔ ان دونوں کے کانوں نے اوپر بیٹھے پتر کار کو یہ کہتے سنا۔

''میں پیچھے تک ہو آیا۔ گارڈ کے ڈبے کو بھی جلانے کی کوشش کر رہے ہیں''۔

اسی وقت تین سپاہی اندر آئے۔ ایک وہی تھا جو تھپڑ کھانے والے کے ساتھ آیا تھا۔ انھوں نے بار بار اِدھر اُدھر دیکھا۔ نیچے کے برتھوں پر اپنے بوٹ رکھ کر اوپر لیٹے سمٹے لوگوں کو نظروں سے ٹٹولا۔ وہ جوا کھیلنے والے اُن دو لڑکوں کو تلاش کر رہے تھے جو وہاں سے پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ ایک سپاہی نے رتن کو گھورا۔ وہ رتن کو سپاہی کو تھپڑ مارنے کے واقعے کا چشم دید گواہ بنانا چاہتا تھا لیکن رتن تو موجود تھا مگر اس کا ساتھی غائب ہو چکا تھا۔ رتن نے گواہی دینے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس کے صاف انکار پر یکا یک اوپر کی سیٹ پر موٹا آدمی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے دیکھا تھا، سب کچھ دیکھا تھا''۔ یہ کہہ کر وہ فربہ آدمی نیچے اُترا۔ ''چلیے میں گواہی دینے چلتا ہوں''۔

سپاہی خوش ہو کر اس مسافر کو اپنے ساتھ لے گئے۔

''ایک بجے رات سے پہلے نیند نہیں آتی''۔ یہ کہہ کر وہ پتر کار نیچے اُتر آیا۔ رتن کے پاس سکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کس نوکری کے لیے انٹرویو دینے جا رہے ہیں؟''

''بینک کی''۔

''اوہ''۔ پتر کار کھل اُٹھا۔ ''پھر تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی''۔ پھر اس نے رتن سے معلوم کرنا چاہا۔

''آجکل انٹرویو میں بہت پوچھتے ہیں۔ آپ کو تو آتا ہوگا؟''

''کیا؟'' رتن نے پوچھا۔

"وندے ماترم۔ کہتے ہیں وندے ماترم سناؤ"

"ہاں آتا ہے"۔ میں نے جس اسکول میں پڑھا ہے وہاں سوریہ نمسکار اور وندے ماترم Compulsary ہے"۔

پھر یہ ہوا کہ۔

تھوڑی دیر میں سب کچھ بدل گیا۔

تھوڑی دیر میں فربہ آدمی گواہی والا کام کر کے اپنی برتھ پر آ کر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں بدامنی کے خلاف قانونی کاروائی ختم ہوگئی۔ زمین پر پھیلے ہوئے مٹی کے کلہڑ صاف کر دیئے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں آہیں بھرتی ہوئی خوفزدہ ماؤں کو نیند آگئی"۔ آخر کو اندھیرے اور روشنیوں کی دوڑتی بھاگتی زنجیروں سے گذرتی ٹرین نے اپنا سفر ختم کیا۔

اب نیا سفر شروع ہو رہا تھا۔ رتن آئینے کے سامنے ٹائی کی گرہ درست کر رہا تھا۔ اپنے سارٹیفکٹ اور مارکس شیٹ کی فائل سنبھال رہا تھا۔ آخر کو وہ ساعت بھی آگئی جب وہ انٹرویو لینے والے پینل کے سامنے والی اکیلی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ٹھیک اس کے سامنے دو لوگوں کے درمیان ایک بھاری بھرکم آدمی اپنی نوکیلی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ یکایک اس کی بھاری آواز رتن کے کانوں سے ٹکرائی۔

"پتا نہیں آپ بھارت ماتا کی جے بولتے ہیں یا نہیں، بولتے ہیں تو اکیلے بولتے ہیں یا بھیڑ میں"

"جیسی ضرورت ہوتی ہے ویسے بولتا ہوں" رتن نے فوراً جواب دیا۔

"گڈ"۔ پینل کے چیئر پرسن نے کہا "مطلب بھارت ماتا کی جے۔ ضرورت کے وقت بولی جاتی ہے"۔

"جی"۔

"اچھا جو لوگ بھارت ماتا کی جے نہیں بولنا چاہتے وہ آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

''وہ دیش درو ہی ہیں''۔ رتن نے فوراً جواب دیا۔ جواب سن کر پوچھنے والا مسکرایا، اس نے اپنے برابر داہنی طرف بیٹھے دودھ جیسے سفید بالوں والے ممبر کو دیکھا جو سوٹ بوٹ میں کسا بیٹھا تھا۔ اس نے اداس سی آواز میں سوال کیا۔

میں آپ سے کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔ ویسے ہی جیسے نئے بننے والے دوست سے جانا جاتا ہے۔ ''کیا آپ بتائیں گے؟''

''ضرور!'' رتن نے جواب دیا۔ سفید بالوں والے کی آنکھوں کی اداسی کم نہ ہوئی، ٹھنڈی سانس لیکر بولا۔

''میں اپنے بیتے ہوئے دنوں کی کچھ باتیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں لیکن بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کیا آپ انھیں بچائے رکھ سکتے ہیں؟''

''کونسی باتیں؟'' سفید بالوں والا کچھ دیر سوچتا رہا پھر مری ہوئی آواز میں بولا۔

''محرم میں میرے پتاجی امام حسین کے سمان میں کویتائیں لکھتے تھے۔ جیسے

پربھو نام پر گلا کٹایو سب گھر دیو لٹائے
ست کی سیوا اس کیہو کہ کلجگ سیس نوائے

یہ شعر سفید رومالوں پر چھپوا کر اپنے مسلمان دوست کو دیتے تھے، وہ ان رومالوں میں مجلس کا تبرک رکھ کر بانٹتے تھے۔ بجرنگ بلی کے مندر تک ننگی پیٹھ کے بل جانے والے ہزاروں شردھالوؤں کے لیے میرے پتا کے مسلمان دوست پچاسوں بہشتیوں کو لگا دیتے جو لگاتار ڈامر کی سڑک کو پانی چھڑک چھڑک کر ٹھنڈا کرتے رہتے تھے تاکہ شردھالوؤں کا سفر آسان ہو جائے۔ لیکن ان سادہ دل بہشتیوں نے بھارت ماتا کی جے بولے بغیر یہ کام کیا۔ تمہاری بیتی یادوں میں ایسا کچھ ہے کیا؟''

''نہیں۔ ہمارا اتیت اور بھوشیہ دونوں ہی آپ کے اتیت اور بھوش سے الگ ہوں گے۔

''ٹھیک کہتے ہو'' سفید بالوں والے ممبر نے مسکرا کر کہا۔

خاموشی ہوئی تو اداس آدمی دھیرے سے بولا۔

''چلو تمہارے ورتمان پر بات کرتے ہیں۔تم کو اپنا ورتمان کیسا لگتا ہے؟''

''پہلے سے اچھا''۔

آج کے کسی ایسے مندر کا نام لو، جس میں بھارت ماتا کی آتما براجتی ہو''

رتن سوچ میں پڑ گیا۔ ایسے مندر تو بہت تھے جو بھارت کے وجود کو قائم اور دائم رکھے ہوئے تھے، وہ کس کا نام لے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سفید بالوں والے نے پھر سوال کیا۔

''آپ بینک کی نوکری کے لیے آئے ہیں''

''جی ہاں''۔رتن نے جواب دیا۔

''کیا بھارتی بینکوں میں بھارت ماتا کی آتما نہیں براجتی''

''براجتی ہے''رتن نے سر ہلایا۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے سناٹا پھیل گیا۔ بھاری بھرکم آدمی اپنے سامنے رکھے کاغذات کو گردن جھکائے دیکھ رہا تھا۔آخر کو گردن اُٹھا کر بولا۔

''آپ کی مارک شیٹ بتاتی ہے کہ اکاؤنٹ کے Subject میں 97% پرسینٹ نمبر لائے ہیں۔آپ نے ہمارے امتحان میں بھی اچھا کیا ہے۔آپ تندرست بھی ہیں بنکوں کو جو کچھ چاہیئے وہ آپ کے پاس ہے۔لیکن ہم آپ سے کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہیں، یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ کے پاس اور کیا ہے۔

''ضرور۔پوچھئے''رتن نے خوش ہو کر کہا۔

''مان لیجئے آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں۔آپ کے سامنے پبلک پیلیس پر اسی ڈبے میں کچھ مسافر تاش کا غیر قانونی جوا کھیل رہے ہیں۔اتنے میں پولیس کے سپاہی آجاتے ہیں اور ان جواریوں کو اس غیر قانونی حرکت سے روکتے ہیں مگر غلط کام بند کرنے کے بجائے ایک جواری اپنی ڈیوٹی انجام دینے والے سپاہی کے زوردار تھپڑ مار دیتا

ہے۔ایسے موقعے پر آپ کس کا ساتھ دیں گے۔ جواری کا یا تھپڑ کھانے والے سپاہی کا؟"

سوال سن کر رتن چونکا۔ وہ غور سے سوال کرنے والے بھاری بھر کم ممبر کو دیکھنے لگا۔ اسے شک ہوا کہ اس چہرے کے نقوش کچھ دیکھے ہوئے ہیں۔اس نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ آدمی یقیناً اس کے کمپارٹمنٹ میں موجود تھا، کیا یہی وہ آدمی تھا جو تھپڑ مارنے والے کے خلاف گواہی دینے گیا تھا؟ رتن نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دل کی بات کو چھپائے گا نہیں۔بھاری بھر کم ممبر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"بولئے۔آپ جواری کا ساتھ دیں گے یا سپاہی کا؟"

"جو پولیس نردوش لوگوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائے میں اس سے ہمدردی نہیں کرسکتا"۔

پینل کا تیسرا ممبر جو اب تک چپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا تیز لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"آپ کی نظر میں پیسہ کمانا زیادہ ضروری ہے یا بھارت ماتا کی جے بولنا؟"

"میں پیسہ کمانا پسند کروں گا۔ پیسہ ہے تو بھارت ماتا کی جے بولنا بھی سارتھک ہوگا"۔

تیسرے آدمی نے پھر تیز لہجے میں سوال کیا۔

"بینکوں کو لوٹ کر پیسہ کمانا۔اس کمائی کے مینار پر بیٹھ کر بھارت ماتا کی جے بولتے رہنا کیا بھارت ماتا کے ساتھ دُش کرم یا بدسلوکی کرنے کے برابر نہیں ہے؟"

یہ سن کر رتن کو کچھ جوش آگیا۔ بولا

"دُش کرم تو بہت طرح کے ہیں۔مزا دُش کرم کا ہے ہی نہیں" یہ سن کر سفید بالوں والے نے ٹوکا۔

"اچھا تو آپ دُش کرموں کو مزا نہیں مانتے"

رتن کے بدن میں سنسناہٹ سی ہوئی، جھڑک کر جواب دیا۔

"تھوڑا۔بہت دُش کرم تو ہم سب ہی اپنی ماتاؤں کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

اصل مدا تو بھارت ماتا کی جے نہیں بولنے کا ہے"۔

سفید بالوں والے نے پھر سوال کیا۔

"اگر میں صبح صبح اُٹھ کر بھارت ماتا کی جے بولوں اور دن بھر دُش کرم کرتا رہوں تو آپ مجھے کیسا آدمی کہیں گے؟"

"آپ ان لوگوں کے مقابلے میں اچھے آدمی ہوں گے"

"کن لوگوں کے مقابلے میں؟" پوچھا گیا۔

"ان لوگوں کے مقابلے میں جو اندھیر کرتے ہیں"

"کیسا اندھیر؟" سفید بالوں والے نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"یہی کہ دُش کرم بھی کرتے ہیں اور بھارت ماتا کی جے بھی نہیں بولتے۔ اب اس سے بڑا اندھیر بھلا اور کیا ہوگا۔

پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ رتن کے سامنے بیٹھے تین جسم بالکل ساکت ہو چکے تھے۔ اسی وقت رتن کا ساتھی کسی جلوس میں نعرے لگا کر دفتر کے سامنے چائے کی گمٹی میں بیٹھا رتن کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یکا یک بیچ میں بیٹھے بھاری بھر کم ممبر نے رتن کو غور سے دیکھا پھر دھیرے سے کہا۔

"تھینک یو مسٹر رتن لال۔ آپ سے مل کر آج ہم بھی اپنے ساتھ کچھ لیکر جا رہے ہیں۔

"کیا؟۔ مجھے بھی بتایئے" رتن نے دلچسپی لی۔ بھاری بھر کم آدمی نے داہنی طرف بیٹھے اپنے ساتھی کو دیکھ کر کہا۔

"بتا دیجئے انھیں" ساتھی مسکرایا اور اس سے پہلے کچھ بولے تیسرا بول پڑا۔

"ہم آپ سے لیکر جا رہے ہیں ایک چھوٹا سا لفظ"

"کون سا لفظ؟" رتن نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"جو ابھی آپ نے بولا تھا۔ یہ کہہ کر وہ ممبر ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے

ساتھیوں کے ساتھ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت اس کا ساتھی جو درمیان میں بیٹھا تھا وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کو لیموں کی طرح کسی نے نچوڑ لیا ہو۔اس کا چہرہ اُداس اور زرد ہو چکا تھا۔اپنی جگہ پر کھڑے ہونے کے بعد وہ خود کو لڑکھڑانے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔''اب ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے۔کمرے میں سناٹا ہو جائے گا۔ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ممکن ہے تب یہاں کوئی چھوٹا سا لفظ گونجے۔سنا ہے لفظ چاکری کرتے ہیں،کبھی نیزہ ہاتھ میں لیکر اور گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر چنگیز کی چاکری تو کبھی بھکشوں کی طرح پتھریلی زمین پر چھالے پڑے تلوں کے ساتھ پیدل چلنے کی چاکری''۔

یہ کہہ کر اس بولنے والے نے گردن جھکالی۔شاید درد کی ایک بوجھل سی فضا چاروں طرف چھا گئی تھی۔پھر تھکے تھکے قدموں سے وہ سب باہر نکلنے لگے تو ان کے کانوں میں کسی بزرگ عورت کی سرگوشی سنائی دی۔''روکو۔انھیں روکو'' مگر تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔کمرہ خالی ہو چکا تھا اور اکیلا کمرہ اور اس کا اندھیرا اور سناٹا۔

ہر طرف سے بس ایک ہی لفظ دھیمی آواز میں دہرا رہا تھا۔

اندھیر!!

اندھیر! !!

●●

ٹھیک سے بتا نہیں سکتی

عاشق مزاج تو وہ لڑکپن سے ہی تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کے بیچ میں کسی نہ کسی بہانے سے گھسے رہنے والا، اس جھرمٹ میں وہ ایک دو لڑکیوں کو نظر میں چھانٹ کر رکھ لیتا اور پھر ان کے اشاروں پر ناچتا۔ ان کے چھوٹے موٹے کام اندر باہر کے کرتے کرتے نہ تھکتا۔ محلے میں اسے ایسے گھر معلوم تھے جہاں لڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔ گھر والے جب اسے دیر تک گھر سے غیر حاضر پاتے تو انھیں گھروں سے اسے ڈھونڈ نکالتے جہاں لڑکیاں ہوتیں۔

جب اس نے ایم ایس سی کیا تو اچھے ہاتھ پیر نکالے، رنگ گورا ناک نقشہ تیکھا، آنکھیں پُرکشش پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی آواز موسیقی کے لیے نہایت موزوں تھی اور وہ اپنے وقت کے مقبول فلمی گانے اس قدر سُر تال کے ساتھ گاتا کہ سننے والے کھنچے چلے آتے۔ کالج میں نوجوانوں کا ایک گروہ جو شادی بیاہ کی تقریبوں میں موسیقی کی محفلوں میں حصہ لیکر کچھ کمائی کرنے کا شوقیہ کاروبار کرتا رہتا تھا یوسف کو اپنے گروپ میں شامل کرنے کے لیے کوشش میں لگ گیا۔ وہ گروپ "Little wings" کے نام سے مشہور تھا، جس میں آرکیسٹرا کے فنکار تو کئی تھے اور اپنے فن میں خاصے ماہر بھی مگر اچھے گانے والوں کی اس گروپ میں کمی تھی البتہ ایک لڑکی ضرور تھی وہ بھی بنگالی، نازک نازک سی خوبصورت اور لمبی لیکن گانا بس واجبی ہی گاتی تھی البتہ اپنے چہرے مہرے سے مجمع کو باندھے رہنے کا جتن کسی حد تک کر لیتی تھی۔

یوسف میاں نے ایم ایس سی کی ڈگری تو لے لی تھی لیکن ماں کو یہ نہ معلوم تھا کہ بیٹا ابھی مکتب عشق میں بھی سبق لے رہا ہے۔ گروپ کی وہ بنگالی لڑکی جو عقیدتاً کرسچین تھی یوسف میاں پر مرمٹی تھی۔ یوسف کو بھی وہ چھریری سی اور لمبی سی ہنس مکھ لڑکی جو سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھتی تھی بہت پسند آئی تھی۔ لڑکی نے پوچھا تھا

''میں کرسچین تم مسلمان۔ کیسے کیا ہو گا؟''

''تم کرسچین رہنا میں مسلمان رہوں گا۔ ہم لوگ نہ تو دن رات کرسچین رہ پاتے ہیں اور نہ مسلمان، بس کبھی کبھی ذرا دیر کو کرسچن یا مسلمان ہو جاتے ہیں''۔

''اور ہمارے بچے؟'' لڑکی نے آگے کی بات بھی جاننا چاہی تھی تو یوسف مسکرا کر بولا تھا۔

''جب بچے ہوں گے تب دیکھا جائے گا''۔ وہ ہنی مون کا دور تھا اتنی کٹھور سچائیوں کے مقابلے کا نہیں۔

ایک دن یوسف نے اس خوبصورت سی اور لمبی سی بنگالی لڑکی کو بتایا۔

''لتا۔ ایک کمپنی ممبئی میں ہے۔ سیلس ریپریزنٹو مانگے ہیں اس نے، لمبی بیکاری جھیل لی ہے، گانے بجانے سے بھی کچھ نہیں مل رہا ہے۔ سوچتا ہوں چلا جاؤں''۔

''ممبئی؟'' لتا نے سوال کیا۔

''وہاں میرا چاچا ایڈوکیٹ ہے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں''۔ لتا کچھ سوچ کر راضی ہو گئی۔

یوسف کی ماں کے سینے پر وقت گھونسہ تان چکا تھا اور کسی وقت بھی وہ گھونسہ پورے زور کے ساتھ ماں کی چھاتی پر پڑنے کو تھا۔ دوسری ماؤں نے یوسف کی ماں کو جب اس کے گھونسہ پڑ گیا تو سمجھایا۔

''ہم کو دیکھو، ہمارے دونوں بچے باہر ہیں۔ پھر یوسف کمانے جا رہا ہے، تمہارے بھی ہاتھ میں کچھ تو آئے گا۔ دو کام تمہارے بھی نکلیں گے۔ لڑکا بیکار ہو تو رشتہ بھی تو نہیں آتا۔

اور اس طرح یوسف ممبئی میں ماں باپ سے دور کام پر لگ گیا،کئی مہینے گذر گئے ماں کو بیٹے نے ایک دمڑی بھی نہ بھیجی۔ کچھ دنوں میں لتا بھی آگئی ایک بنگالی ساڑی اسٹور میں سلیس گرل کا کام کرنے لگی۔گھر دور تھا تو کیا ہوا چند دنوں میں لوکل پر چڑھنا اُترنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا۔شہر کی رنگینیوں کی چکا چوندھ کچھ ایسی آنکھوں میں چبھی کہ ایک دن وہ یوسف کے ساتھ مال کے ایک ریسٹورینٹ میں بیٹھی کہہ رہی تھی۔

''ہم سب پھیلنا چاہتے ہیں، بڑھنا چاہتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو کچھ بھی آگے نہ بڑھے کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''نہیں، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ کیریر بنانا ہو تو اسی طرح سوچنا پڑے گا''۔

''ممبئی میں بہت اچھے پب ہیں، مجھے کسی چھٹی میں کسی پب میں لے چلو، Expences آپس میں بانٹ لیں گے۔

یوسف کے علاوہ اس کے ماں باپ کا اور کوئی نہ تھا۔اس لیے یوسف کی ماں اپنے بیٹے کی خیر و عافیت کے لیے پریشان رہتی، فون کرتی تو یوسف کبھی اُٹھاتا اور کبھی دیر دیر تک گھنٹی بجتی رہتی۔لتا بھی ممبئی آگئی ہے اور لتا کون ہے اس کی سدھ بدھ ماں کو لٹل ونگس کے ممبروں کے ذریعے یوسف کے ممبئی جانے سے پہلے ہی مل چکی تھی۔

اُنھیں دنوں دوبئی کی ایک کمپنی کو سلیس مینجروں کی ضرورت ہوئی، یوسف کا انتخاب کرلیا گیا۔ یوسف نے ماں باپ کو اطلاع کی۔ باپ نے یوسف کی ماں کو بتایا کہ ایک دن ریٹائرڈ ہونے سے پہلے وہ اپنا گھر بھی اب بنالے گا۔ یوسف لتا سے چھوٹ رہا تھا اور لتا کی محبت کے لیے وہ صورتِ حال خاصی آزمائش کی تھی۔اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یکا یک ایک ایسا دن بھی آجائے گا کہ یوسف اسے چھوڑ کر سات سمندر پار چلے جانے کا فیصلہ کرلے گا۔

ممبئی میں لتا کی مراٹھی خاتون دوست نے لتا کو سمجھایا ''اپن کی اس بدلتی دنیا میں

چھوٹی بڑی بہت سے لڑائیاں لڑنے کو ملیں گی، سمے بدل رہا ہے، ہمارا پڑھنا لکھنا مردوں کے بیچ رہنا ہنسنا بولنا ہر دم کپڑے ٹھیک رکھنا اپنی امیج بنائے رکھنا، دوستیاں کرنا، دشمنیاں سہنا طرح طرح کے سمبندھوں کو کبھی جوڑنا تو کبھی توڑنا کسی کو مارنا اور کسی پر مرنا اس بدلتے ہوئے سمے میں ہم کو تم کو بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں، یوسف کی چنتا لیکر نہیں بیٹھنے کا، نہیں تو بال سفید ہو جائیں گے۔

یوسف کی مردانی کلائی گھڑی جو اس کے نانا باندھا کرتے تھے جب وہ ممبئی آنے لگا تو ماں نے اس کی کلائی پر باندھ دی تھی۔ لڑکیوں میں بڑی گھڑیاں فیشن میں آگئیں تو وہ گھڑی لتا نے یوسف سے مانگ لی۔

''جب تک تم دوبئی سے نہیں آؤ گے اسی گھڑی کو دیکھ کر وقت کاٹوں گی''۔ لتا نے کہا تھا۔

یوسف کی ممبئی سے دوبئی کی فلائٹ کی تاریخ میں ابھی دس روز باقی تھے کہ یوسف اپنی کمپنی سے استعفیٰ دے کر رخصت سے پہلے اپنے ماں باپ کے گھر آگیا۔ یوسف کے آنے سے پہلے ہی یوسف کے ماں باپ کے پاس لتا سے اس کے عشق کی داستانیں دھیرے دھیرے کر کے پہنچ چکی تھیں۔ ماں نے یوسف کے باپ کو ٹوکا۔

''لڑکا گھر آیا ہے۔ لتا والے معاملے پر بات کرو، اس سے پوچھو یہ کیسی دیوانگی ہے؟''

وہ نماز پڑھ کر اٹھا تھا۔ تسبیح ختم پر تھی۔ اس نے بیوی سے یہ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کرنا چاہے کہ اب دیوانگی میں بڑی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری کا دخل ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کو موزوں الفاظ نہیں ملے۔ بیوی نے دبی زبان سے پھر شوہر کو ٹوکا۔

''لڑکے سے کھل کر بات کرو، لڑکی کرسچن ہے'' یہ سن کر شوہر کو اچھا نہ لگا، گھور کر بیوی کو دیکھنے لگے مگر بیوی گویا کچھ باتیں سوچ سوچ کر طے کر چکی تھی۔

''میں اتنا جانتی ہوں کہ خاندان میں ہم سب کی آپس کی زندگی میں جس میں ہمارے خاندان کو ملا کر جو ایک کنبہ بنتا ہے اس میں ایک اعتدال اور توازن قائم رہے، کیا لتا یہ توازن بگاڑ نہ دے گی''۔

''کہیں کوئی کنبہ نہیں ہے'' شوہر چلایا۔''شیخ اپنی اپنی دیکھ کا قول رائج ہے، اعتدال اور توازن کے پیمانے بھی بدل گئے ہیں، لڑکے کو جانے دو، دیکھ لینا پلٹ کر پوچھے گا بھی نہیں۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتی ہو جو ابھی کنبہ لیے بیٹھی ہو''۔

یوسف جب ماں باپ سے ملنے کے لیے ٹرین میں بیٹھا تو اس نے پوری ایمانداری سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے سوال کیا کہ کیا وہ واقعی لتا کا دل جیتنا چاہتا ہے تو اس کو جواب ملا۔ لتا خوش مزاج اور ملنسار لڑکی ہے، اچھی دوست ہے۔ بس فی الحال اتنا ہی ہے۔

صرف ایسا ہی نہ تھا کہ لتا کو لیکر صرف یوسف ہی سوچ رہا تھا، غم زدہ اور حیرت میں ڈوبی لتا بھی سوچ رہی تھی کہ کیا وہ یوسف کو دل کے سنگھاسن پر بٹھانا چاہتی ہے۔ تو دل کے کسی کونے سے، بہت سوچ سمجھ کر جواب آیا' اتنی جلدی بھی کیا ہے'۔ زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے پہلے سے بنے بنائے پیمانے کام نہیں کرتے۔ یوسف کے دو بئی جانے میں تین چار روز رہ گئے تو ایک رات ماں نے یوسف سے دھیرے سے پوچھ لیا۔

''بیٹا، لتا کا کیا معاملہ ہے؟''

وہ ہمارے ہی جیسے غریب گھر کی لڑکی ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے، اکثر میرے لیے لنچ بنا کر لاتی ہے۔ اگر کبھی نہیں کھاتا تو سارا کا سارا ڈسٹ بن میں انڈیل دیتی ہے اور بھوکی رہتی ہے''۔ ماں نے پوچھا ''کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

یوسف نے ماں کو بتایا'' ماں میں نے ابھی سوچا نہیں'، جواب ملا۔

''اور اس نے؟'' سوال ہوا۔

"ممکن ہے اس نے سوچا ہو۔ وہ کئی بار یہ سوچ کر روئی ہے کہ میں اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ سن کر ماں ڈر گئی اور جرح کرنے لگی کہ اس طرح تو وہ لڑکی دل ہی دل میں آس لگائے رہے گی۔ خط لکھے گی، تحفے بھیجے گی اور یوسف کی واپسی کے لیے ایک ایک دن گننے گی۔ تو یوسف نے ماں کو یہ بھی بتا دیا کہ ماں کی دی ہوئی گھڑی اس نے لتا کو دے دی ہے۔ اس خبر سے ماں کو دھچکا سا لگا کہ وہ اس کے باپ کی نشانی تھی۔ ماں نے اسے تنبیہ کی کہ وہ گھڑی لتا سے واپس لے کر اسے فوراً بھیج دے۔ یہ سن کر یوسف بڑی الجھ میں پڑ گیا، اسے کہنا پڑا۔

"ایسا میں کیسے کروں۔ اس کو بہت دکھ ہوگا ماں"۔

یوسف کے ممبئی واپس جانے اور وہاں سے دوبئی کے لیے جہاز لینے کے دو دن پہلے یوسف کی بوڑھی ماں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یوسف موٹر سائیکل سے دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس سے گھر واپس آ رہا تھا کہ ڈھلوان راستے پر یکا یک بریک لگانے سے موٹر سائیکل الٹ گئی۔ یوسف ایسا گرا کہ سڑک پر ہی بیہوش ہو گیا۔ افسوس کہ پھر اسے ہوش نہ آیا۔ جس ماں کا اکیلا جوان بیٹا یوں ایکا ایک چلا جائے اس پر کیا گزری ہوگی، اس کا صحیح اندازہ تو اس کا نامراد شوہر بھی نہ کر سکتا تھا۔ ممبئی کے ساتھیوں کو خبر ہوئی تو وہاں سے آنے والوں میں لتا بھی تھی۔ اس نے جس والہانہ طور پر یوسف کی ماں کے پیر چھوئے اور لپٹ کر روئی اس نے ماں کے بوڑھے جسم اور روح تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

پہلی بار کوئی سانولی سلونی دبلی پتلی جوان اور خوبصورت سی لڑکی یوسف کے غم میں اس کی ماں کی آغوش سے لپٹ کر یوں رو رہی تھی جیسے اس کا کوئی سگا مر گیا ہو۔ ماں بیہوش ہو گئی، جب اسے ہوش آیا تو لتا اس کے سرہانے بیٹھی دھیرے دھیرے اس کا سر دبا رہی تھی۔ جب ماں نے آنکھیں کھولیں تو لتا نے اس کو بتایا کہ یوسف ماں کی بہت تعریف کرتا تھا اور ان کی کمی کو دور کرنے کے لیے پریشان رہا کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی

بتایا کہ لتا یوسف کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا یہ سوچ کر خیال رکھتی تھی کہ ماں نہ سہی تو خود لتا ہی عورت کے ناطے ان باتوں کا جہاں تک ممکن ہو خیال رکھے۔ ماں نے دیکھا کہ لتا کی کلائی پر یوسف کی دی ہوئی گھڑی بندھی تھی۔ دوپہر کو وہ ماں کو زبردستی کھچڑی کھلاتے ہوئے اس سے بولی

"اب میں یہاں سے ممبئی نہیں جاؤں گی۔ گھر جاؤں گی پھر چاچی کے پاس کلکتہ چلی جاؤں گی۔ ماں جی میں نے کیا کیا سوچا تھا لیکن کیا ہو گیا۔ پھر وہ رونے لگی۔ شام کو لتا کی ماں کا فون آیا تو لتا نے یوسف کی ماں سے اپنی ماں کی بات کرائی۔ "آپ کا دکھ کیسے بانٹوں" یہ کہہ کر لتا کی ماں کی آواز بھرا گئی۔ لتا نے اپنی ماں کو بتایا کہ دو روز یوسف کی ماں کے پاس رکنے کے بعد لتا گھر آئے گی۔ دو روز دن رات لتا یوسف کی ماں کی خدمت میں لگی رہی، اس کے بستر کی چادر بدلی، اس کی دواؤں کے لفافوں پر ان کے کھانے کا وقت لکھ کر انھیں پلاسٹک کے ڈبے میں رکھا۔ ان کا وارڈ روب درست کیا، کمرے میں رکھے مچھلیوں کے ایکوریم میں مچھلیاں بھوکی تھیں انھیں دانہ ڈالا۔ ماں کے سر میں تیل ڈال کر زبردستی کنگھی کی۔ ایک بات کا احساس لتا کو دیر میں ہوا تھا۔ رات لتا جس گدے پر بیٹھی تھی وہ گدا یوسف ممبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا جس پر وہ خود لیٹا کرتا تھا، ماں نے وہ گدا لتا کے لیے بچھوایا تھا۔

صبح نہا دھو کر لتا جب باورچی خانے میں ماں کے لیے خاص طور پر ناشتہ تیار کرتی جو زیادہ تر ہلکے پھلکے بنگالی اور مراٹھی ناشتے ہوا کرتے۔ تو ماں اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی۔

چلتے وقت ماں بستر پر لیٹی تھی۔ لتا اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی، دونوں پیر پکڑ کر اپنا ماتھا پیروں پر رکھ دیا، پھر کلائی کی وہ گھڑی اتاری جو یوسف نے اسے دی تھی، گھڑی ماں کے ہاتھ میں رکھ کر بولی۔

''اس کی حقدار میں نہیں آپ ہیں''

تین چار روز قیام کر کے لتا اپنے گھر چلی گئی جو یوسف کے شہر کے پڑوس میں واقع تھا۔ کچھ دنوں بعد کسی ملازمت کے لیے کلکتہ جانے سے پہلے لتا اپنی ماں کے ساتھ یوسف کی ماں سے ملنے آئی اور ان سے لپٹ کر پھر خوب روئی، یوسف کی ماں کے زخم پھر کھل اُٹھے۔ لتا نے باورچی خانے میں یوں قدم رکھا جیسے وہ اس کے اپنے گھر کی رسوئی ہو۔ پلک جھپکتے ہی کھانے پینے کا ضروری سامان تیار کیا۔ دہی کی نمکین لسی اپنی اور یوسف کی ماں کے لیے تیار کی۔ دوپہر میں یوسف کی ماں کے بستر پر ان کے پہلو میں لیٹ کر یوسف کے ساتھ اپنی باتوں کی یادیں دہرائیں اور ماں کو رُلایا اور شام کو واپس روڈویز کے بس اڈے سے بس لیکر اپنی ماں کے ساتھ گھر سے نکلنے ہی کو تھی کہ ان کی نظر یوسف کی ماں کی کلائی پر بندھی اس گھڑی پر پڑی جو کبھی لتا کے پاس تھی اور جسے لتا نے یوسف کی ماں کو واپس کر دیا تھا۔ لتا نے یوسف کی ماں کی اس کلائی کو آنکھ سے لگایا اور بڑبڑائی۔

''ماں جی سمے بڑا بلوان ہے''۔

پھر یہ ہوا کہ ہر آٹھویں دن یوسف کی ماں کے پاس لتا کا فون آنے لگا۔ ایک بار لتا نے بتایا کہ اس کے ایک دوست کو مغل کھانے بہت پسند ہیں اور وہ بریانی پکانا چاہتی ہے۔ یوسف کی ماں نے فون پر اسے بریانی کا سامان لکھوایا پھر بار بار بریانی پکانے کی ترکیب فون کر کر کے لتا کے دماغ میں بٹھائی۔ کبھی کبھی فون پر دو دو گھنٹے گگنگ کے یہ سبق استاد اور شاگرد کے درمیان چلا کرتے اور شاگرد کے غلطی کرنے پر ماں وہ چیخ پکار مچاتی کہ سارے گھر میں بھونچال سا آجاتا۔

کچھ روز بعد لتا انکم ٹیکس آفس میں باپ کے کسی کام کی غرض سے آئی تو رات کو یوسف کی ماں کے گھر بھی آگئی، وہ یوسف کی ماں کے لیے تحفے میں ایک خوبصورت سی ریشمی جائے نماز لیکر آئی تھی۔ رات کو وہ یوسف کی والدہ کے بستر پر ہی ان کے پہلو میں لیٹی اور

یوسف کے ممبئی کے قیام کے دوران کے قصے ماں کو سنا سنا کر خود بھی روئی اور ماں کو رلاتی رہی۔ چلتے وقت لتا نے یوسف کی فریم میں لگی ایک تصویر دی جس میں یوسف لتا کا دوپٹہ پکڑ کر اسے کھینچ رہا ہے اور لتا ہنستے ہوئے اس کو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''یہ تصویر میرے پرس میں لگی تھی، اس کو بڑا کروا کر میں نے آپ کے لیے فریم کرادی ہے۔ چاہیں تو میز پر لگا سکتی ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ فریم لتا نے میز پر رکھ دیا اور چلی گئی۔ تقریباً دو مہینے گذر گئے مگر لتا کا کوئی فون نہیں آیا۔ ایک دن یکایک یوسف کی ماں کے فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے چہک کر لتا کی آواز آئی۔

''ماں میں لتا بول رہی ہوں''۔

''لتا۔'' یوسف کی ماں خوشی سے چلائی۔

''کہاں ہو، کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، کلکتے میں ہوں، نوکری کر رہی ہوں''۔

''اچھا۔'' ماں چونکی۔ ''ارے تو کیسی لڑکی ہے، مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں؟ اور اب کیسے یاد آئی میری۔ تب بڑے جوش اور خروش سے اس نے بتایا کہ اس کا ایک بوائے فرینڈ ہے جو مسلمان کم اور سندھی زیادہ ہے، لتا سے کہتا ہے کہ اگر لتا اس کو سندھی بریانی پکا کر کھلائے تو وہ لتا کے لیے مسلمان سے کرسچن ہونے کو تیار ہے۔ یہ کہہ کر لتا فون پر خوب ہنسی اور بولی ''میرا پورا نام لتا بنجامین ہے۔ میں ہندو سے کرسچن ہوئی ہوں پھر اس کو جیسے یاد آگیا'' ماں تمہارے ہاتھ جوڑوں مجھے سندھی بریانی پکانا سکھا دو''۔

یوسف کی ماں نے لتا کو اس طرح پہلی بار کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیکر اپنی جگہ رہ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے لتا کی ہنسی سن کر ایک دھکہ سا لگا، پتہ نہیں کیوں اس نے ایسا سوچ لیا تھا کہ لتا اب کبھی اس کے سامنے ہنسے گی نہیں۔

ایک دن لتا ایک تھیلے میں رس گلوں کے دو بند ڈبے جو غالباً وہ کلکتے سے لائی تھی

اپنے ساتھ لیکر یوسف کی والدہ کے گھر میں داخل ہوئی۔ یوسف کی ماں نے دیکھا اس کی بائیں کلائی میں ویسی ہی بڑی سی گھڑی بندھی ہوئی تھی جیسی کہ یوسف نے اسے دی تھی لیکن وہ اپنی چمک دمک میں نئی نویلی گھڑی لگ رہی تھی۔ یوسف کی ماں دھیرے دے بولی۔

"بڑی پیاری گھڑی باندھے ہو"

"برتھ ڈے پر کسی نے دی ہے"۔ پھر جلدی سے بولی "چلئے کچن میں بریانی پکاتے ہیں"۔ وہ یوسف کی ماں کا ہاتھ پکڑ کر باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہاں کام کرنے کے دوران کئی بار یوسف کا نام اس کے منہ سے نکلا، اس دن اس نے ماں کو بتایا کہ کبھی کبھی خاص موقعوں پر یوسف شراب کا ایک آدھ پیگ لے لیا کرتا تھا اور بدبو چھپانے کے لیے امرود کھالیتا تھا مگر لتا نے ایک بار اس کو پکڑ لیا اور اس کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ اور یوسف کو دھمکی دی کہ اگر پھر اس نے شراب کو ہاتھ لگایا تو لتا اس کے سامنے گو کھائے گی۔ ماں نے پہلی بار یہ ماجرا لتا کے منہ سے سنا تھا، شاک کی حالت میں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر لتا کی آنکھیں صاف تھیں وہ ہنس رہی تھی۔ شام کی بس سے جب لتا اپنے گھر چلی گئی تو یوسف کی ماں گم صم حالت میں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی، اسے یہ احساس نہ ہوا تھا کہ لتا کے جانے سے گھر کا سناٹا گہرا ہو جاتا ہے، آخر پھر سے وہ شوہر سے بولی۔

"پہلے یوسف کے ذکر پر میرے ساتھ لتا کی بھی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں لیکن اب وہ ہنستی رہتی ہے"۔

جن دنوں یوسف کے ماں باپ کے پاس لتا کی شادی کا کارڈ آیا، یوسف کی ماں گٹھیا کے درد سے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ یوسف کے والد نے لتا کے گھر والوں کو ایس ایم ایس کر کے شرکت نہ کر پانے کے لیے معافی مانگ لی اور دولہا دلہن کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

لتا کی شادی ہوئے مشکل سے پندرہ روز گزرے ہوں گے کہ لتا اپنے شوہر کے ساتھ صبح صبح آدھمکی۔ یوسف کے ماں باپ سے اپنے شوہر کو ملوایا پھر یوسف کی ماں کے کان میں بولی ''یہی ہے سندھی بریانی کا شوقین۔ آج دوپہر میں اسے سندھی بریانی کھلاتے ہیں''۔

وہ جلدی جلدی یوسف کی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف ہوگئی۔ ملازمہ موجود تھی مگر لتا نے اسے باورچی خانے سے باہر کر دیا۔ اس کا دولہا یوسف کے باپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگیا۔ جب چاول دم کھانے لگے تو یوسف کی ماں سے فرمائش کی۔

''وہ تصویر کہاں ہے جو فریم میں لگا کر میں نے آپ کو دی تھی۔ ماں نے دراز سے نکال کر تصویر کو جھاڑا پونچھا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور لتا کو تھما دی۔ لتا ایک الگ کمرے میں اپنے شوہر کو لے گئی۔ اور بولی۔

''آنکھیں بند کرو تو ایک چیز دکھاؤں''۔ شوہر نے آنکھیں بند کیں تو لتا نے یوسف کی وہ تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ پھر دونوں کے درمیان اس تصویر کا جلدی جلدی تبادلہ ہونے لگا۔

یوسف کی ماں کنکھیوں سے اپنے کمرے سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ لتا بڑے انہماک سے شوہر کو وہ تصویر دکھا رہی تھی اور ہنس ہنس کر کچھ بتاتی جا رہی تھی۔ شوہر کے اس تصویر میں دلچسپی لینے کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ لتا پہلے ہی شوہر کو اس تصویر کا پس منظر غالباً بتا چکی تھی۔

کھانے پر یوسف کی والدہ نے لتا کے شوہر سے سوال کیا۔

''کیا تم یوسف کو جانتے ہو؟'' سوال سن کر وہ ہنسا پھر بولا۔

''نہیں یوسف کا ذکر کر کر کے لتا میرا دماغ بہت بار چاٹ چکی ہے''۔

جب دولہا دلہن کی رخصت کا وقت آیا تو یوسف کی والدہ نے شوہر سے پوچھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کیا دیا جائے؟"

"تم جیسا مناسب سمجھو دو، مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو"۔

یوسف کی ماں کچھ دیر سوچتی رہی پھر الماری کے لاکر سے زیوروں کا بکس نکالا۔ سونے کی بھاری جھمکیوں کا جوڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس جوڑے کو وہ اُداسی سے دیکھتی رہی، وہ جھمکیاں اس نے پچاس سال پہلے اپنے نکاح کے موقعے پر پہنی تھیں۔ یکا یک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے ساڑی کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں اور وہ خوبصورت جھمکیاں لتا کے کانوں میں پہنا دیں۔ لتا بار بار ان ٹھوس اور خوبصورت مینا کاری کے کام والی جھمکیوں کو آئینے میں دیکھتی اور بار بار خوشی سے یوسف کی ماں کو باہوں میں بھر لیتی۔

لتا کو کلکتہ واپس گئے چند روز ہو گئے تھے۔ گھر میں بڑا سناٹا تھا، یوسف کے باپ نے چپ بیٹھے بیٹھے بیوی سے یہ سوال پوچھ کر گھر کی خاموشی توڑی۔

"سمجھ میں نہ آیا، لتا کو اتنی قیمتی تحفہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یوسف کی ماں نے شوہر کی بات سن کر اسے نظر اُٹھا کر دیکھا پھر گردن جھکا لی۔ کچھ وقفہ خاموشی میں گزر گیا پھر ایک بار شوہر کی آواز آئی۔

"تم نے بتایا نہیں؟" شوہر کے دوسری بار پوچھنے پر وہ اُداس لہجے میں بولی۔

جب وہ گھر آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یوسف بھی آنے والا ہے۔ پتا نہیں کیسا لگتا ہے۔ کچھ ٹھیک سے نہیں بتا سکتی۔

پھر یہ ہوا کہ ماں یوسف کو بھول کر کسی انتظار میں کھوئی رہنے لگی۔ شوہر اس کے گم صم رہنے کا سبب پوچھتا تو ٹھنڈی سانس لیکر دھیرے سے جواب دیتی۔

"پتا نہیں۔ کچھ ٹھیک سے بتا نہیں سکتی"۔

میں دیکھ رہا تھا بولتے وقت اس کے اندر خاصا غصہ بھرا ہوا تھا۔ مجھے اس لیے اس میں دلچسپی بھی ہونے لگی تھی۔ دراصل غصے میں بولتے ہوئے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ایسے لوگ Status quo کے خلاف بولتے ہیں۔ ایسے غصے کو مبارکباد دینا چاہیے۔ میں نے دیکھا غصے کا دباؤ بولنے والے کے سینے میں بڑھتا جا رہا تھا جس کے نقوش اس کی بل پڑی پیشانی تمتماتے ہوئے گالوں اور سوکھے ہونٹوں پر ابھر آئے تھے۔ ہاتھ میں ریموٹ پکڑے کرسی میں جکڑا آنکھیں پھاڑے میں بولنے والے کو دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ وہ ذرا کرخت اور بلند آواز میں بولا۔ مجھے چقندر نا پسند ہیں۔ میں چقندر کھانے والوں کے چہرے پر سیاہی پوتنے میں خوشی محسوس کروں گا۔ میرا ایمان ہے کہ چقندر اس زمین پر لال ہو کر پیدا ہوتا ہے جس میں بے گناہ لوگ قتل کر کے گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں تو میں جواب دوں گا یہ میری آستھا کا سوال ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ چقندر کے شوقین ہی چھت پر لال بیکن لگی گاڑیوں پر چلنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

خاموش مکالمہ

KHAMOSH MUKALAMA

by IQBAL MAJEED

کتاب دار

KITAB DAAR

108/110, Jalal Manzil, Temkar Street, Mumbai - 400 009. Mob.: 9869 321477